اور تلوار ٹوٹ گئی
حصہ اول
نسیم حجازی

فہرست

انتساب

محمد بہادر خاں

نواب بہادر یار جنگ مرحومؒ

کے نام

پیش لفظ

معظم علی اور اس کے بعد۔۔۔ اور تلوار ٹوٹ گئی، لکھتے وقت میرے دل و دماغ پر یہ احساس ہمیشہ غالب رہا کہ سلطان شہیدؒ کی شخصیت کو کسی ناول کا موضوع بنانا ایک بہت بڑی جسارت تھی۔

ابتداً میں ایک ایسے اولعزم مجاہد کے کردار سے متاثر ہوا تھا جس نے ہندی مسلمانوں کے دور انحطاط میں محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ وجلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم واستقلال کی یاد تازہ کر دی تھی، لیکن سلطنت خداداد کی تاریخ کے اوراق الٹتے وقت میں یہ محسوس کرتا ہوں، کہ سلطان فتح علی خان ٹیپو کی زندگی کے کئی اور حسین پہلو ابھی تک میری نظروں سے پوشیدہ تھے۔ شیر میسور کی فتوحات صرف جنگ کے میدانوں تک محدود نہ تھیں، بلکہ وہ بیک وقت ایسا حکمران، عالم، مفکر و مصلح تھا۔ جس کے دل و دماغ کی وسعتوں میں اسلامیان ہند کے ماضی کی عظمتیں، حال کے ولولے، اور مستقبل کی آرزوئیں سما گئی تھیں۔ وہ ہمیں زندگی کی ہر دوڑ میں اپنے وقت سے کئی منزلیں آگے دکھائی دیتا ہے۔ اس نے ایک ایسے دور میں فلاحی ریاست کا نمونہ پیش کیا تھا۔ جب کہ باقی ہندوستان کے نواب اور راجے اپنی رعایا کی ہڈیوں پر عشرت کدے تعمیر کر رہے تھے۔ اس نے اس زمانے میں بین الاسلامی اتحاد کے لیے جدوجہد کی تھی، جب کہ اہل اسلام اپنے نااہل حکمرانوں کی تنگ نظری، کمزوری، بے حسی اور باہمی رقابتوں کے باعث مغرب کے سامراجی بھیڑیوں کے لئے ایک عظیم شکار گاہ بن چکا تھا۔ اس نے ہندوستان کے ایک ایسے پس ماندہ علاقے میں عدل وانصاف کے جھنڈے گاڑھے تھے، جہاں صدیوں سے جہالت اور افلاس کی تاریکیاں مسلط تھیں۔ حیدر علی اور سلطان ٹیپو سے قبل میسور کے

عوام کی کوئی تاریخ نہیں تھی، لیکن ان کی حکمرانی کے چند برس پورے ہندوستان کی تاریخ پر چھائے ہوئے ہیں۔

جب ہندوستان کے عوام اپنے حال اور مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے، تو میسور میں حوصلوں اور ولولوں کی ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی ۔ جب مشرقی ہندوستان کے قلعوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے جھنڈے نصب ہو رہے تھے،تو سلطنت خدا داد کے یہ معمار سرنگا پٹم، منگلور، اور چیتل ڈرگ میں قوم کی آزادی کے نئے حصار تعمیر کر رہے تھے۔

حیدر علی کے حکومت کے آخری ایام میں میسور کی ریاست ایک عظیم سلطنت بن چکی تھی۔لیکن اس کے ساتھ ہی وہ طاقتیں جو جنوبی ہندوستان میں ایک اسلامی سلطنت کے قیام کو اپنے لیے ایک مستقل خطرہ سمجھتی تھی ۔اس کے خلاف متحد اور منظم ہو چکی تھی ۔۔

انگریز میسور کو دلی کے راستے کی آخری دیوار سمجھتے تھے، میر نظام علی نہ صرف میسور بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی عزت اور آزادی کو اپنی ذلیل سودا بازیوں کا مسئلہ سمجھتا تھا۔

اور مرہٹے سلطنت مغلیہ کے کھنڈروں پر برہمنی استبداد کی عمارت کھڑی کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے ۔شیر میسور نے اس وقت سلطنت خداداد کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لی تھی، جب بھیڑیوں، گیدڑوں اور گدھوں کے لشکر اس کے کچھار کا محاصرہ کر رہے تھے۔اور وہ اس وقت تک ان کے سامنے سینہ سپر رہا، جب تک اس کی رگوں کا سارا خون میسور کی خاک میں جذب نہیں ہو چکا تھا۔

اس ناول کے بیشتر کردار وہ مجاہد ہیں۔ جو ایک عظیم فوجی رہنما کے جلو میں

ہمارے سامنے آتے ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ میسور کی جنگیں اس داستان کا اہم ترین حصہ بن گئی ہیں۔ان طویل اور صبر آزما جنگوں کا معمولی جائزہ ہمیں یہ اعتراف کرنے پر مجبور کردیتا ہے۔کہ انگریزوں نے ہندوستان پر تسلط جمانے کے لیے جو جنگیں لڑی تھیں۔وہ اپنی شدت اور وسعت کے اعتبار سے میسور کے معرکوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔بلکہ ہندوستان کی پوری تاریخ میسور کے مجاہدوں کے صبر واستقلال اور ایثار وخلوص کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے، کہ ایک فوج حملہ کرتی ہے، اور دوسری اس کے مقابلے کے لیے نکلتی ہے۔پھر مختلف محاذوں پر اکا دکا جھڑپوں کے بعد کسی میدان مین فیصلہ کن معرکہ ہوتا ہے، اور جو فریق شکست کھا جاتا ہے۔وہ برسوں تک اپنے طاقت ور حریف کے سامنے سر اٹھانے کا نام نہیں لیتا۔

ازمنہ قدیم میں آرین وسط ایشیا سے نکلتے ہیں۔اور چند لڑائیوں کے بعد ہندوستان کی قدیم اقوام کو مغلوب کر لیتے ہیں۔سکندر اعظم یونان سے نکلتا ہے۔دریائے جہلم کے کنارے راجہ پورس کو شکست دیتا ہے۔اور اس کے بعد یونان کے لشکر کو اپنے سامنے پانچ دریاؤں کی سر زمین خالی نظر آتی ہے۔محمد بن قاسم، ایک سترہ سالہ نوجوان کے ساتھ آنے والے مٹھی بھر مجاہدین دیبل اور برہمن آباد کے میدانوں میں راجہ داہر کو شکست دینے کے بعد ہمیشہ کے لیے سندھ سے برہمنی اقتدار کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔محمود غزنوی اپنے ابتدائی چند حملوں میں پورے شمالی ہندوستان سے راجپوتوں کا اقتدار ختم کر دیتا ہے، اور اس کے بعد قنوج اور سومنات میں عبرت ناک شکست کھانے والے راجوں کو صدیوں تک مسلمانوں کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔پھر بابر مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔اور

اس ملک کی تاریخ کا رخ بدل دیتا ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد مرہٹے ہر ہر مہادیو کے نعرے لگاتے ہوئے اٹک تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں ایک بار پٹنے کے بعد دوبارہ شمالی ہندوستان کی طرف دیکھنے کی بھی جرات نہیں کرتے، پھر ایسٹ انڈیا کمپنی پلاسی اور بکسر کی نمائشی جنگوں کے بعد کلکتہ سے لے کر لکھنو تک اپنی فتوحات کے جھنڈے نصب کر دیتی ہے۔ لیکن میسور میں سلطان ٹیپو کی تلوار کے سامنے انگریزی جارحیت کا سیلاب رک جاتا ہے۔ اور مسلسل سولہ برس تک ایسٹ انڈیا کمپنی جنوب سے دلی کی طرف کوچ کرنے کا خواب نہیں دیکھ سکتی۔

میسور کی دفاعی قوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میسور کے بعد جب مرہٹوں کی باری آئی تو سندھیا، بھونسلے، اور ہلکر جن کی افواج کی مجموعی تعداد میسور سے کہیں زیادہ تھی، چند ماہ سے زیادہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقابلہ نہ کر سکے۔ سن ۱۸۰۳ء میں سندھیا اور بھونسلہ کو پے در پے شکستیں دینے کے بعد دستے دہلی میں داخل ہو چکے تھے۔ اور شاہ عالم مرہٹوں کی بجائے کمپنی کی سرپرستی قبول کر چکا تھا۔ سن ۱۸۰۴ء میں فرخ آباد کے مقام پر ہلکر شکست کھا چکا تھا۔ چند سال بعد مرہٹوں نے فرنگی جارحیت سے نجات حاصل کرنے کی ایک اور کوشش کی، لیکن انگریزوں کی سنگینوں کے سامنے ان کے لاکھوں سپاہی بھیڑوں کے ریوڑ ثابت ہوئے۔ اس کے بعد سارا ہندوستان انگریزوں کے رحم و کرم پر تھا۔

یہاں پر ہمیں ایک اور حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ یہ کہ سلطان شہید کے وہ پیش رو جنھوں نے اپنی نوک شمشیر سے ہندوستان کی تاریخ کو نئے عنوان عطا کیے تھے۔ اپنے زمانے کے عظیم جرنیل ہی نہیں تھے، بلکہ ان زندہ اور

متحرک اقوام کے جذبہ تسخیر کی نمود تھے۔ جن کی ماضی کی تاریخ شکست، پسپائی، مایوسی اور ناکامی کے الفاظ سے نا آشنا تھی، محمد بن قاسم اس قوم کی غیرت کا مظہر تھا۔ جس کے مجاہد مشرق میں چین اور مغرب میں اندلس کے دروازوں کو دستک دے رہے تھے۔ محمود غزنوی کی سلطنت وسط ایشیا سے لے کر خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ احمد شاہ ابدالی بھی ایک عظیم سلطنت کا مالک تھا۔ اور اس کے جھنڈے تلے افغانوں، مغلوں، روہیلوں اور بلوچوں کا بہترین عنصر جمع ہو گیا تھا۔ لیکن سلطان ٹیپو نے جن لوگوں کو آزادی کی تڑپ عطا کی تھی۔ ان کا ماضی صرف پس ماندگی غربت، اور جہالت کے تذکروں تک محدود تھا، میسور کی بیشتر آبادی غیر مسلم تھی۔ ہندو سماج میں ان فرومایہ لوگوں کو ان بہادر راجپوتوں یا جنگجو مرہٹوں کی برابری کا دعویٰ نہ تھا۔ جو اپنے اسلاف کے کسی کارنامے پر فخر کر سکتے۔ ان لوگوں کو مسلمانوں کے دوش بدوش کھڑا کر کے کئی برس انگریزوں، مرہٹوں اور حیدر آباد کی سلطنت کا مقابلہ کرنا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ آخر وہ کون سے حالات تھے، جنھوں نے ان لوگوں کے دل و دماغ پر اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا؟۔

اس اہم سوال کا جواب تلاش کرتے وقت سلطان شہید کی سیرت و کردار کے کئی اور حسین پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اور ایک ضخیم ناول لکھنے کے بعد بھی مین یہ محسوس کرتا ہوں کہ سلطان شہیدؒ کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لیے ایک ناول نگار سے زیادہ جب مورخ اور سیرت نگار اپنی متاع گم گشتہ کی تلاش مین نکلیں گے تو سرنگاپٹم ان کے راستے کی اہم ترین منزل ہوگی۔

میسور کی جنگ آزادی صرف ایک اولوالعزم حکمران کی جنگ نہ تھی، بلکہ صدیوں کے ان پس ماندہ مظلوموں اور بے بس انسانوں کے ذوق نمود کا مظاہرہ

تھا۔ جنھیں سلطان شہیدؒ نے جہالت اور افلاس کے دلدل سے نکال کر تہذیب واخلاق کی منزل پر بٹھا دیا تھا۔ یہ داستان ان سرفروشوں کی ہمت، شجاعت اور ایثار کی داستان ہے، جنھیں ایک صحیح الخیال مسلمان حکمران نے زندگی کے آداب سکھائے تھے۔ لیکن کاش یہ روح پرور اور ولولہ انگیز داستان ان حریص قسمت آزماؤں کے تذکرے سے خالی ہوتی، جن کی ابن الوقتی، وطن فروشی، اور غداری کے باعث سرنگا پٹم کے شہیدوں کی بے مثال قربانیاں ایک بدنصیب قوم کی تقدیر نہ بدل سکیں، کاش ہمیں اپنے ماضی کی تاریخ کے روشن ترین صفحات میں میر صادق، قمر الدین، پورنیا، میر نظام علی، اور میر عالم جیسے لوگوں کے نام دکھائی نہ دیتے!۔

میں یہ داستان اس ملت کے جوانوں کو پیش کررہا ہوں۔ جس کی سطوت کے پرچم سلطان ٹیپو کی شہادت کے دن سرنگوں ہوگئے تھے۔ اور جسے قدرت نے ایک طویل غلامی کے بعد پاکستان کو اپنا حصار بنانے کا موقع دیا ہے۔ آج ڈیڑھ سو سال بعد سلطان شہیدؒ کی روح سرنگا پٹم کے کھنڈروں کی طرف اشارہ کرکے ہمین یہ پیغام دے رہی ہے۔ کہ جو قوم اپنی صفوں میں کسی میر صادق کو جگہ دیتی ہے۔ اس کا کوئی قلعہ محفوظ نہیں ہوتا۔ جس جہاز کا کوئی مسافر اس کے پیندے میں سوراخ کررہا ہو، اسے دنیا کے بہترین ملاح بھی ڈوبنے سے نہیں بچا سکتے۔ ملت کے عظیم ترین رہنماؤں کے خون، پسینے اور آنسوؤں سے صرف اس خاک پر آزادی کے نخلستان سیراب ہوتے ہیں، جو غداروں کے وجود سے پاک ہو۔

راولپنڈی نسیم حجازی

۶ مارچ ۱۹۵۸ء

آں شہیدانِ محبت را امام

آبروئے ہند وچین و روم وشام

نامش از خورشید ومہ تابندہ تر

خاک قبرش از من و تو زندہ تر

از نگاہ خواجہ بدرو حنین

فقر سلطان، وارثِ جذبِ حُسینؑ

----------اقبالؒ---------

پہلا باب

معاہدہ منگلور کی رو سے میسور اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی دوسری جنگ کا خاتمہ، فوجی اور سیاسی لحاظ سے سلطان ٹیپو کی بہت بڑی فتح تھی انگریزوں نے میر نظام علی اور مرہٹوں کے بھروسے پر جنگ شروع کی تھی۔اور ابتدا میں ان کی کامیابیاں حوصلہ افزا تھیں، تاہم نظام اور مرہٹے جنگ کے نتائج کے متعلق پورا اطمینان حاصل کیے بغیر میدان میں کودنے کے لیے تیار نہ تھے۔بدنور کی فتح کے بعد انگریزوں کو یہ امید ہوگئی تھی کہ اب ان کے مذبذب حلیف مال غنیمت میں حصہ دار بننے کے لیے میسور پر اچانک یلغار کردیں گے۔لیکن جنگ کی دوسرے دور میں میسور کا زخمی شیر اپنے فولادی پنجے انگریزوں کے سینے میں گاڑھ چکا تھا۔اور وہ گدھ جنھیں گھرے ہوئے شکار پر جھپٹنے کی دعوت دی جارہی تھی، اپنے اپنے نشیمن سے ایک بدلی ہوئی صورت حال کا مشاہدہ کررہے تھے۔

انگریزوں نے اس وقت صلح کا جھنڈا بلند کیا تھا۔جب منگلور میں ان کے محصور لشکر کو کسی فوری اعانت کی امید نہ تھی۔سلطان کے توپ خانے کی بے پناہ گولہ باری کے باعث قلعے کی دیواریں ایک ایک کرکے منہدم ہورہی تھیں۔رسد اور بارود کے ذخیرے ختم ہوچکے تھے۔انگریز قلعے کے باہر نگاہ دوڑاتے، تو انھیں آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل دکھائی دیتے۔وہ قلعے کے اندر دیکھتے تو انھیں زخموں، وبائی امراض اور بھوک سے دم توڑتے ہوئے ساتھیون کی قابل رحم صورتیں دکھائی دیتیں۔منگلور کی طرح وہ دوسرے محاذوں پر بھی بری طرح مار کھارہے تھے۔کڈلور میں ان کی بہترین فوج فرانسیسی لشکر کے ہاتھوں مکمل تباہی کا سامنا کررہی تھی۔

جنوبی ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے جارحانہ عزائم کو ہمیشہ کے لیے

خاک میں ملانے کا یہ بہترین موقع تھا۔لیکن اچانک یورپ سے یہ خبر پہنچی کہ برطانیہ اور فرانس کے درمیان صلح ہوگئی ہے۔اوروہ ہندوستان میں بھی لڑائی بند کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔فرانسیسی سپہ سالار نے یہ خبر سنتے ہی انگریزوں کے ساتھ جنگ بند کردی۔

فرانس کے تعاون سے محروم ہو جانے کے باوجود سلطان ٹیپو کے پاس اتنی طاقت تھی کہ وہ انگریزوں پر ایک فیصلہ کن ضرب لگا سکتا تھا،لیکن جنگ جاری رکھنے کی صورت میں سلطان کو ایک طرف نظام اور مرہٹوں کے حملے کا اندیشہ تھا اور دوسری طرف اس کے لیے ان باج گزار، راجوں اور پالی گاروں کی سرگرمیاں ایک عظیم خطرہ بن چکی تھی، جنھوں نے انگریزوں، مرہٹوں اور میر نظام کی شہ پر بغاوت کے جھنڈے بلند کردیے تھے۔

اس کے علاوہ سلطان ٹیپو محض ایک اولوالعزم سپاہی نہ تھا۔بلکہ وہ ایک ان تھک معمار بھی تھا۔رعایا کی فلاح وترقی کے ساتھ اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ جنگ کے میدان میں بھی دریاؤں پر بند باندھنے، نہریں کھودنے، بنجر زمینیں آباد کرنے، سڑکیں تعمیر کرنے اور صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے علاوہ عوام کی تعلیمی اور معاشرتی حالت سدھارنے کے عظیم منصوبے تیار کرتا تھا، میسور کے عوام کی ترقی وخوش حالی کے متعلق اپنے سپنوں کی تعبیر کے لیے اسے امن کی ضرورت تھی۔لیکن اس کے دشمن یہ سمجھ چکے تھے کہ سلطان ٹیپو ان کے راستے کا آخری پتھر ہے، اور اگر اسے امن کے چند سال مل گئے تو سلطنت خداداد ہندوستان کی عظیم ترین طاقت بن جائے گی۔ چنانچہ صلح نامہ منگلور کے بعد انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کی یہ کوشش تھی کہ سلطان کو کسی نہ کسی محاذ پر مصروف رکھا جائے۔

جنگ سے فارغ ہوتے ہی سلطان کو سب سے پہلے نرگنڈا اور کورگ کی طرف توجہ دینی پڑی، یہ ریاستیں میسور کی باج گزار تھیں، لیکن گذشتہ جنگ سے فائدہ اٹھا کر وہاں کے راجے سلطان کے خلاف بغاوت کر چکے تھے، سلطان نے مصالحت کے لیے نرگنڈ کی برہمن راجا ونکٹ راؤ کے پاس اپنا ایلچی بھیجا، لیکن وہ مرہٹوں کی شہ پا کر مصالحت کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ سلطان نے مرہٹوں کو میسور کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے باز رکھنے کے لیے ایک سفارت پونا روانہ کیا، لیکن نانا فرنویس ایک مدت سے میسور کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اور پیشوا کے علاوہ تقریباً تمام مرہٹہ راجے اس کے قبضے میں تھے۔ اس لئے سلطان کی مصالحانہ کوشیش کامیاب نہ ہوئیں۔

سلطان نے مجبوراً ایک لشکر برہان الدین کی قیادت میں نرگنڈا کی طرف روانہ کیا، برہان الدین نے نرگنڈ سے چند میل دور ونکٹ راؤ کو شکست دی۔ اور اسے نرگنڈ کے قلعے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، نانا فرنویس نے تیس ہزار سپاہی ونکٹ راؤ کی مدد کے لئے روانہ کر دیے۔ اور برہان الدین نے مرہٹوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے نرگنڈ کے قلعے کا محاصرہ اٹھا لیا۔

برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا، اور راستے کے نالوں اور دریاؤں میں طغیانی کے باعث مرہٹوں کے لیے اپنے بھاری ساز و سامان کے ساتھ آگے بڑھنا دشوار تھا، چنانچہ مرہٹہ فوج کا سپہ سالار پرس رام بھاؤ رام، ڈرک میں پڑاؤ ڈال کر برسات کے اختتام اور مزید فوج کا انتظار کرنے لگا۔ برہان الدین نے مرہٹوں کے حملے کا انتظار کرنے کی بجائے اچانک منولی کی طرف یلغار کر دی۔ مرہٹوں نے مجبوراً آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن میسور کی فوج نے انھیں پے در پے

شکستیں دینے کے بعد منولی اور رام ڈرگ پر قبضہ کرلیا۔چند دنوں میں مرہٹہ لشکر پیہم شکستیں کھانے کے بعد دریائے کرشنا تک کا تمام علاقہ خالی کر چکا تھا۔اور نرگنڈ کی طرف کے تمام راستے منقطع ہو چکے تھے۔

ان شان دار فتوحات کے بعد برہان الدین نے دوبارہ نرگنڈ کے قلعے کی طرف توجہ دی،ونکٹ راؤ نے چند دن مقابلہ کیا،لیکن مرہٹوں کی پسپائی کے باعث اس کا حوصلہ ٹوٹ چکا تھا۔چنانچہ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔نرگنڈ کا قلعہ فتح کرنے کے بعد برہان الدین نے ونکٹ راؤ کے دوسرے حلیف راجوں اور پالی گاروں پر چڑھائی کردی۔اور کتھور،دودواد،خانہ پور،ہوسکوٹ،پادشاہ پور،اور جمبوٹی کے قلعے فتح کرلیے۔

قریباً اسی زمانے میں سلطان کی فوج کا ایک اور سالار حیدر علی بیگ کورگ کے نائروں کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا،کورگ کی مہم جس قدر اہم تھی اسی قدر مشکل تھی،یہ علاقہ مغربی گھاٹ کے ان پہاڑوں میں واقع ہے،جہاں سال میں چھ مہینے لگاتار بارش ہوتی ہے۔پہاڑوں کے دامن میں چشموں اور خوشنما جھیلوں کے علاوہ بانس،ساگوان،صندل،اور دوسرے درختوں کے گھنے جنگل تھے،جن میں جگہ جگہ شیروں اور چیتوں کے علاوہ ہاتھیوں کے ریوڑ دکھائی دیتے تھے،کہیں،کہیں وادیوں کے نشیب میں جنگلوں کی بجائے دھان کے کھیت اور پھل دار درختوں کے باغ نظر آتے تھے،

کورگ میں نائر قوم کے قد آور،سڈول اور صحت مند باشندے تہذیب وتمدن کے لفظ سے نا آشنا تھے۔مردوں کی طرح عورتیں بھی نیم عریاں لباسوں میں رہتی تھیں۔ہمسایہ اضلاع کے بہت کم لوگ کورگ کے دشوار گزار پہاڑوں اور جنگلوں کا

رخ کرنے کی جرات کرتے تھے۔ متمدن ہندوستان کے لیے اس علاقے کے باشندوں کی خوبصورتی، عریانی، اخلاقی بے راہ روی، وحشت اور بربریت کی داستانیں کوہ قاف کی پریوں اور جنوں کے قصوں سے مختلف نہ تھیں۔

میسور کی فوج نے ابتدا میں کورگ کے باغیوں کے خلاف چند کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن دشوار گزار جنگلوں اور پہاڑوں میں باغیوں کا پلہ بھاری ہونے لگا، نائر اپنی خفیہ پناہ گاہوں سے نکل کر اچانک میسور کے لشکر کے عقب یا میمنہ اور میسرہ پر حملہ کرتی اور آن کی آن میں پہاڑوں اور جنگلوں میں روپوش ہو جاتے۔ حیدر علی بیگ اس خطرناک مہم کے لیے نا اہل ثابت ہوا، اور اس نے ایک گھنے جنگل میں دشمن کے پے در پے حملوں سے بدحواس ہو کر پسپائی اختیار کی۔

ان حالات میں سلطان ٹیپو کو بذات خود میدان میں آنا پڑا۔ نائروں نے قدم، قدم پر ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن سلطان کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ اور انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ سلطان نے زین العابدین مہدوی کو کورگ کا صوبیدار مقرر کیا، اور خود سرنگاپٹم لوٹ آیا۔ اس عرصہ میں نانا فرنویس جسے نرگنڈ اور کورگ میں سلطان کی فتوحات نے بہت مضطرب کر دیا تھا۔ سلطان کے خلاف مرہٹوں، نظام، اور انگریزوں کا متحدہ محاذ بنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اور اس کی افواج دریائے کرشنا کے کنارے جمع ہو رہی تھیں۔

ایک دن فرحت بالاخانے کے ایک کمرے میں بیٹھی اپنی خادمہ سے باتیں کر رہی تھی۔ اچانک سیڑھیوں پر کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ اور آن کی آن میں ایک بارہ سال کا سانولے رنگ کا لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔

خادمہ نے کہا منور تم کیسے نالائق ہو۔ بی بی جی نے کتنی بار تمہیں سیڑھیوں پر

بھاگنے سے منع کیا ہے۔؟

منور نے خادمہ کو جواب دینے کی بجائے فرحت کی طرف متوجہ ہو کر کہا، بی بی جی آج ایک مہمان آئے ہیں۔ وہ کوئی بہت بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کریم خاں نے ان کا گھوڑا اصطبل میں باندھ دیا ہے۔ اور میں انھیں دیوان خانے مین بٹھا آیا ہوں۔ انھوں نے آتے ہی بھائی جان انور علی، اور بھائی جان مراد علی کے متعلق پوچھا۔ میں نے جواب دیا کہ بھائی جان انور علی یہاں نہیں ہیں۔ اور مراد صاحب اس وقت مدرسے میں ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے دلاور خان اور صابر کے متعلق پوچھا، میں نے جواب دیا، کہ صابر مر چکا ہے۔ اور دلاور خان بھائی جان انور علی کے ساتھ گیا ہوا ہے۔ پھر انہوں نے پوچھا تم کون ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں بی بی جی کا نوکر ہوں۔ فرحت نے کہا تم نے ان کا نام نہیں پوچھا؟

جی انھوں نے خود ہی کہا تھا، کہ بی بی جی سے میرا اسلام کہو اور انھیں یہ بتاؤ کہ میرا نام اکبر خان ہے

فرحت کے لیے یہ خبر غیر معمولی تھی، وہ چند ثانیے بے حس حرکت بیٹھی رہی، اور پھر مضطرب سی ہو کر بولی، منور جاؤ انھیں اندر لے آؤ، اور نیچے کے بڑے کمرے میں بٹھا دو۔ منور بھاگتا ہوا نیچے اترا، لیکن نصف سے زیادہ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد وہ اچانک رکا اور دبے پاؤں نیچے اترنے لگا۔

رہائشی مکان کی چار دیواری سے باہر نکل کر وہ دیوان خانے کے ایک کمرے مین داخل ہوا۔ اکبر خاں کسی گہری سوچ میں سر جھکائے بیٹھا تھا، اس کی ٹھوڑی اور کنپٹیوں کے قریب داڑھی کے کچھ بال سفید ہو چکے تھے۔ لیکن چہرے پر ابھی تک جوانی کی دل کشی کے کچھ آثار ابھی باقی تھے۔

منور نے کہا،، جناب بی بی جی آپ کو اندر بلاتی ہیں۔اکبر خاں پچھ کہے بغیر اٹھا،اور منور کے ساتھ چل دیا تھوڑی دیر بعد وہ رہائشی مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے ۔اور منور نے کہا جناب آپ تشریف رکھیں۔میں بی بی جی کو اطلاع دیتا ہوں۔

منور باہر نکل گیا اور اکبر خاں ایک کرسی پر بیٹھ گیا،کمرے مین قالین کے اوپر شیروں اور چیتوں کی چند کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ایک دیوار کے ساتھ کھونٹیوں پر چند تلواریں اور بندوقیں ٹنگی ہوئی تھیں،دوسری دیوار کے ساتھ ایک خوبصورت تختی پر ایک خنجر اور دو پستول پڑے ہوئے تھے،باقی دو دیواروں کے ساتھ کتابوں کی الماریاں تھیں۔اور یہ سب اس شخص کی یادگاریں تھیں،جو اکبر خاں کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز تھا،معظم علی کے ساتھ رفاقت کے زمانی کے ان گنت واقعات ایک،ایک کرکے اس کے سامنے آرہے تھے،اس کی شہادت کی خبر سننے سے پہلے یہ بات کبھی اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی، کہ کسی دن وہ سرنگا پٹم جائے گا،اور وہاں معظم علی نہیں ہوگا۔تنہائی،بےبسی کے ایک کرب انگیز احساس کے تحت اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

کمرے میں کسی کی آہٹ سنائی دی،اس نے آنکھیں کھولیں،فرحت ایک سفید چادر اوڑھے اس کے سامنے کھڑی تھی،بھائی اکبر السلام علیکم،اس نے لرزتی ہو ئی آواز میں کہا۔

اکبر جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا،اس نے سلام کا جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے،اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

فرحت نے دروازے کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا،اکبر بیٹھ جاؤ۔

وہ بیٹھ گیا۔ چند ثانیے دونوں خاموش رہے، بالآخر اکبر خان نے گردن اٹھائی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا،، بھابھی جان قدرت کی اس سے زیادہ ستم ظریفی کیا ہوسکتی ہے، کہ میں زندہ تھا، اور مجھے دو سال تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ میرا عزیز ترین بھائی اوراس کے دو جوان بیٹے شہید ہو چکے ہیں۔ یہ محض اتفاق تھا کہ پچھلے دنوں سرنگا پٹم کا ایک تاجر حیدر آباد گیا، اور وہاں اس کی ملاقات بلقیس کے ماموں جان سے ہوگئی، اورانھوں نے یہ خبر سنتے ہی مجھے خط لکھ دیا۔

فرحت نے آب دیدہ ہوکر کہا،، مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اطلاع نہ دے سکی، مجھے ان کی شہادت کے کئی ماہ تک اپنا ہی ہوش نہ تھا۔

اکبر نے کہا، بھابھی جان میں آپ سے شکایت نہیں کرتا، مجھے صرف اس بات کی ندامت ہے کہ میں آپ کے حالات سے اس قدر بے خبر رہا۔ بھائی جان کے ساتھ میرا رشتہ ایسا تھا کہ ان کے پاؤں میں کانٹا چبھتا تو مجھے کوسوں دور رہ کر بھی اس کا درد محسوس کرنا چاہیے تھا، مجھے آپ کے نوکر نے بتایا ہے کہ انور علی یہاں نہیں ہے۔ وہ کہاں گیا ہے۔

انور علی کسی مہم پر پانڈی چری گیا ہوا ہے۔

کیسی مہم؟

یہ مجھے معلوم نہیں، مین صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہاں اسے جو کام سونپا گیا ہے، اس کے لیے کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی، جو فرانسیسی زبان جانتا ہو، اور انور علی نے یہ زبان فوجی مکتب کے ایک فرانسیسی استاد سے سیکھی تھی، تمھارا چھوٹا بھتیجا بھی فرانسیسی زبان جانتا ہے۔

مراد علی کب تک گھر آئے گا؟

وہ اب آ ہی رہا ہو گا۔

اکبر خان نے قدرے توقف کے بعد کہا، بھابھی جان صابر کب فوت ہوا۔؟

فرحت نے جواب دیا، وہ انور علی کے ابا جان کی شہادت سے کوئی پانچ ماہ بعد وفات پا گیا۔ بڑھاپے میں اس کے لیے یہ صدمہ نا قابل برداشت تھا۔ اسے اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ وہ شہید ہو چکے ہیں۔ اس نے ان کی قبر دیکھنے کے لیے بڈ نور جانے کی اجازت مانگی، ہم کچھ مدت اسے ٹالتے رہے، بالآخر میں نے اسے وہاں جانے کی اجازت دے دی، جب وہ واپس آیا تو اس کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی۔ کوئی پندرہ دن بعد نوکر نے مجھے اطلاع دی کہ اس کی حالت بہت نازک ہے، میں نے جا کر دیکھا تو وہ وہاں بے ہوش پڑا تھا۔

میں نے نوکر کو طبیب کے پاس بھیجا۔ لیکن اس کے آنے سے پہلے وہ وفات پا چکا تھا۔

تم نے مجھے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا؟ بلقیس، شہباز اور تنویر کیسے ہیں۔

وہ سب ٹھیک ہیں، بلقیس آپ کو بہت یاد کرتی ہے، شہباز اب جوان ہو چکا ہے، اور میں نے اپنے کئی فرائض اسے سونپ دیے ہیں، تنویر بھی اب چودہ سال کی ہو چکی ہے۔ میں نے اس کی منگنی اس کے خالہ کے لڑکے ہاشم بیگ کے ساتھ کر دی ہے۔ اس کی چھوٹی بہن ثمینہ کی عمر نو سال ہے، میں اسے کہا کرتا تھا کہ شہباز کے علاوہ اس کے چار بھائی اور بھی ہیں، اور وہ سرنگا پٹم میں رہتے ہیں، کبھی شہباز یا تنویر سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تھا تو وہ یہ دھمکی دیا کرتی تھی، کہ میں اپنے سرنگا پٹم والے بھائیوں کے پاس چلی جاؤں گی۔ نماز کے بعد وہ ہمیشہ صدیق، مسعود، انور اور مراد کے لئے دعائیں کیا کرتی تھی، اور بار، بار مجھ سے یہ گلہ کیا کرتی تھی، کہ مین

انہیں اپنے گھر کیوں نہیں بلاتا، اور میں نے اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ جب شہباز یا تنویر کی شادی ہو گی تو میں ان سب کو بلاؤں گا، ان کے ساتھ تمہارے چچا جان اور چچی جان بھی آئیں گے۔ بھائی جان کی شہادت کے متعلق شیخ فخر الدین کا خط ملنے سے پہلے وہ بڑی بے تابی کے ساتھ اپنی بہن اور بھائی کی شادی کا انتظار کیا کرتی تھی، اب جب میں اس طرف آرہا تھا تو وہ میرے ساتھ آنے پر بضد تھی، اور میں نے اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میں تمھاری چچی اور بھائیوں کو ساتھ لے کر آؤں گا،

فرحت نے کہا،، کاش میں وہاں جا سکتی۔

اکبر خاں نے کہا راستے میں ایک دن عطیہ کے ہاں ٹھہرا تھا، وہ بھی آپ کو بہت یاد کرتی تھی،

فرحت نے پوچھا، عطیہ کے بچوں کا کیا حال ہے۔

اکبر خان نے جواب دیا، ہاشم بیگ کے سوا اس کی کوئی اولاد نہیں۔ وہ بڑا ذہین اور خوش وضع نوجوان ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ دنیا میں کوئی اچھا کام کرے گا۔ لیکن طاہر بیگ نے اسے ادھونی کی فوج میں ملازم کروا دیا ہے۔

کمرے سے باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی، اور فرحت نے کہا مراد آگیا،،

مراد علی جو پندرہ سال کی عمر میں ہی پورا جوان معلوم ہوتا تھا، کمرے میں داخل ہوا اور حیران سا، اکبر خاں کی طرف دیکھنے لگا،

فرحت نے کہا بیٹا تم نے انھیں سلام نہیں کیا، یہ تمہارے چچا اکبر خان ہیں۔

چچا جان السلام علیکم، مراد علی یہ کہہ کر آگے بڑھا، اکبر خاں نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا، اور پھر دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے،

فرحت نے کہا بیٹا آج تم نے بہت دیر کر دی۔

مراد علی نے جواب دیا، امی جان آج جب چھٹی ہونے والی تھی، تو برہان الدین اچانک مکتب کے معائینہ کے لیے وہاں آ گئے تھے، اس لئے ہمیں وہاں کچھ دیر رکنا پڑا،

اکبر خاں نے کہا مراد تمھاری تعلیم کب ختم ہو گی؟

مراد علی نے جواب دیا۔ چچا جان میں قریباً تین ماہ بعد مکتب سے فارغ ہو جاؤں گا۔ اور اس کے بعد تم کیا کرو گے؟

اس کے بعد میرے لیے فوج میں شامل ہونے کے سوا کچھ اور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے مکتب کے ہر فارغ التحصیل نوجوان کے لیے فوج میں شامل ہونا ضروری ہے،

ہاں چچا جان فوجی درس گاہ کے قیام کا مقصد ہی یہی ہے کہ فوج کو تربیت یافتہ افسر مہیا کیے جائیں۔ لیکن فوج میں شامل ہونے کے لیے ہر طالب علم کا فارغ التحصیل ہونا ضروری نہیں، اشد ضرورت کے وقت ہمیں تعلیم کے دوران میں بھی ہمیں فوجی خدمات کے لئے بلایا جا سکتا ہے، بعض لڑکے تعلیم میں مجھ سے پیچھے تھے، لیکن انہیں صرف اس لیے کمان مل گئی کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑے تھے، پچھلے دنوں ہمارے مکتب کے کئی طالب علم آخری امتحان سے پہلے ہی کورگ کے محاذ پر چلے گئے تھے، میں نے بھی ان کے ساتھ جانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میری درخواست صرف اس لئے نامنظور ہو گئی تھی کہ میں عمر میں چھوٹا تھا۔

اکبر خان نے کہا مراد فرض کرو میں اگر تمہیں یہ مشورہ دوں کہ تمھارے لیے

ایک سپاہی بننے کی بجائے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا بہتر ہے، تو تم کیا جواب دو گے؟۔

مراد علی مسکرایا، میرے نزدیک سپاہی بننا پیشہ نہیں، بلکہ قوم کی خدمت ہے، چچا جان، ابا جان کہا کرتے تھے، کہ آپ پانی پت کے میدان میں ان کے ساتھ تھے، میں آپ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، لیکن اس وقت مجھے تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا ہے، میں ابھی آجاؤں گا،

تم کہا جا رہے ہو، بیٹا فرحت نے پوچھا۔

امی جان میں نیزہ بازی کے لیے جا رہا ہوں۔

منور کمرے میں داخل ہوا، اور اس نے کہا، جناب کریم خاں کہتا ہے کہ میں نے آپ کے گھوڑے پر زین ڈال دی ہے۔

مراد علی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا،

اکبر خان نے کہا بھابھی جان میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں،،، ، برا نہ مانیے گا۔آپ کا خاندان قوم کے لیے بڑی قربانیاں دے چکا ہے۔اب قوم کو یہ حق نہیں کہ آپ سے مزید قربانیوں کا مطالبہ کرے، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ سرنگا پٹم میں آپ کے بچے محفوظ نہیں۔آپ میرے پاس چلیں، مجھے یقین ہے کہ میں انور اور مراد کے لیے کئی اور دلچسپیاں تلاش کر سکوں گا، وہاں ان کے لئے نہایت اچھی زمین حاصل کی جا سکتی ہے،

فرحت نے کہا اکبر تم کیا کہہ رہے ہو، میں اس وطن کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں جس کی حفاظت کے لیے میرے شوہر اور میرے بیٹوں نے اپنا خون پیش کیا تھا۔

لیکن بھابھی جان اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔آخر یہ جنگیں کب ختم ہوں گی، کل تک سلطان انگریزوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھا، اور آج وہ اندرونی بغاوتوں کا سامنا کر رہا

ہے۔اس کے بعد شاید نظام اور مرہٹے میدان میں نکل آئیں۔

فرحت نے کہ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ہماری جنگ ایک مقصد کے لئے ہے۔اس مقصد کے لئے جو تمہارے بھائی کو اپنی اور اپنے بیٹوں کی جان سے زیادہ عزیز تھا۔میں یہ گوارہ کرسکتی ہوں کہ میرے باقی دو بیٹے بھی اس مقصد پر قربان ہو جائیں،لیکن میں یہ گوارہ نہیں کروں گی کہ وہ زندہ رہنے کے لیے اس مقصد سے منحرف ہو جائیں۔

اکبرخان نے لاجواب سا ہو کر کہا،کبھی میں بھی زندگی کے اعلٰے اور ارفع مقاصد پر ایمان رکھتا تھا،لیکن ایک مدت سے میں اس نعمت سے محروم ہو چکا ہوں۔مجھے آپ کے سامنے ایسی گفتگو نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ایک اندھا دوسروں کو راستہ نہیں دکھا سکتا،میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔

فرحت نے کہا بھائی مجھے تمہاری کوئی بات رنجیدہ نہیں کر سکتی،مجھے ان الم ناک واقعات کا علم ہے جن کے باعث تمہاری زندگی میں یہ انقلاب آیا تھا،تمہارے بھائی کو اس بات کا افسوس تھا،کہ تمھارا،راستہ ان سے الگ ہوگیا،لیکن اپنی دعاؤں میں وہ ہمیشہ تمھیں یاد کیا کرتے تھے،وہ یہ کہا کرتے تھے،کہ اکبرخاں نے زمانے کا جو انقلاب دیکھا ہے اس کے بعد اس کا زندگی کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہو جانا میرے لیے غیر متوقع نہیں ہے۔

اکبرخاں نے کہا بھابھی جان روہیل کھنڈ چھوڑنے کے بعد مجھے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ میں زندہ ہوں،میں نے جنگلوں کو کاٹ کر سرسبز باغات اور لہلہاتے کھیت میں تبدیل کر دیا ہے،میں علی الصباح گھوڑے پر سوار ہوتا ہوں،اور سارا دن اپنی زمین کی دیکھ بھال کرنے کے بعد گھر واپس آتا ہوں،میں نے

برسوں کی محنت کے بعد اپنے گاؤں میں عالی شان مکان تعمیر کیا ہے۔ میں نے اپنے ساتھ آنے والے پناہ گزینوں کی خوش حالی اور ترقی کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اور اب تک ان کی پانچ بستیاں آباد ہو چکی ہیں۔ وہ اس قدر آسودہ حال ہیں کہ اب انہیں روہیل کھنڈ کی یاد نہیں ستاتی، یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے میں نے بھائی جان سے الگ راستہ اختیار کیا تھا، مجھے اپنی کارگزاری پر مطمئن ہونا چاہیئے تھا، لیکن میں اسی طرح بے چین ہوں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے حصے کی تمام مسرتیں روہیل کھنڈ کی خاک میں دفن ہو چکی ہیں، مجھے ذرا ذرا سی بات پر غصہ آ جاتا ہے، جو لوگ مجھ سے محبت کرتے تھے، اب وہ مجھ سے ڈرتے ہیں۔ کبھی، کبھی میں اپنا محاسبہ کرتا ہوں، اور یہ عہد کرتا ہوں، کہ اب اپنے نوکروں یا قبیلے کے لوگوں پر سختی نہیں کروں گا، میں انتہائی غصے کی حالت میں بھی مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن چند دن بعد میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ کبھی، کبھی میرے دل میں یہاں آنے کی خواہش پیدا ہوتی تھی، اور میں یہ تصور کیا کرتا تھا کہ بھائی جان میری آمد کی اطلاع پا کر مسکراتے ہوئے مکان کے کسی کمرے سے نمودار ہونگے، اور مجھے گلے لگا لیں گے۔ پھر میری دنیا کی خاموش فضائیں قہقہوں سے لبریز ہو جائیں گی، لیکن عمل کی دنیا میں میرے ان حسین سپنوں کی کوئی تعبیر نہ تھی، کاش میں وفات سے پہلے انھیں ایک بار دیکھ لیتا، آج میری بے چارگی اور بے بسی اس بچے سے زیادہ ہے، جسے انھوں نے قید خانے کی ایک تاریک کوٹھری میں نئے حوصلوں اور ولولوں سے آشنا کیا تھا۔ اب وہ چراغ جس کی روشنی نے کبھی میرے دل میں بھیانک تاریکیوں سے لڑنے کی جرات پیدا کی، بجھ چکا ہے اور میں بھٹک رہا ہوں۔۔۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اس ملک کے ظالم اور نا اہل حکمرانوں سے میرا آخری انتقام یہی ہو سکتا ہے،

کہ میں اپنی تلوار ہمیشہ کے لیے نیام میں ڈال لوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری بغاوت ان حکمرانوں سے زیادہ اس اکبر خاں کے خلاف ہے، جس کا دل کبھی قوم کی خدمت کے جذبے سے لبریز تھا، اور جو پانی پت کے میدان میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکتا تھا، میں اس انسان کی امنگوں اور آرزوؤں کی لاش ہوں، جس کی رگوں میں خون کی بجائے بجلیاں دوڑتی تھیں، بہن مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

اکبر خان کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو جمع ہو رہے تھے۔

فرحت نے کہا، اکبر تمھیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میری دعائیں ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں،

منور کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا، بی بی جی مہمان کے لیے کھانا تیار ہے، لے آؤں

ہاں جلدی کرو

اکبر خان نے کہا۔ نہیں میں نے رستے میں کھانا کھالیا تھا۔ آپ نے یونہی تکلیف کی،

فرحت نے کہا تھوڑا بہت کھالو،

نہیں بھابھی جان میں تکلف نہیں کر رہا، میں واقعی کھا چکا ہوں۔ اب عصر کی نماز کا وقت ہو چکا ہے۔ میں ذرا مسجد سے ہو آؤں۔

بہت اچھا منور تم ان کے ساتھ جاؤ

اکبر خاں کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ فرحت کو اس کی چال میں کوئی غیر معمولی بات نظر آئی، وہ چلتے وقت ایک پاؤں پر ذرا زیادہ بوجھ ڈالنے کی

کوشش کررہا تھا، وہ اس کی وجہ پوچھنا چاہتی تھی لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کوئی بات کرتی، اکبر خاں کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ ☆ o ☆

تھوڑی دیر بعد جب اکبر خان نماز پڑھ کر واپس آیا، تو فرحت برآمدے مین ایک موڑھے پر بیٹھی ہوئی تھی، صحن عبور کرتے وقت اکبر اسی طرح لنگڑا رہا تھا فرحت نے کہا اکبر کیا بات ہے؟ تمھارے پاؤں میں کوئی تکلیف ہے؟

اکبر چند قدم سنبھل کر چلنے کے بعد برآمدے میں داخل ہوا، اور ایک مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے بولا، جی کچھ نہیں گذشتہ سال ایک لڑائی میں میری ٹانگ پر ایک گولی لگ گئی تھی۔ اب اگر میں کبھی زیادہ سواری کروں یا پیدل چلوں تو ٹانگ میں تکلیف ہو جاتی ہے،

تمھاری لڑائی کس کے ساتھ ہوئی تھی۔ مرہٹہ لٹیروں کے ایک گروہ نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا، یہ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ میرا زندہ بچ نکلنا ایک معجزہ تھا۔ اگر اس دن میری چھوٹی بچی ثمینہ نہ ہوتی، تو آج آپ مجھے یہاں نہ دیکھتیں، روہیل کھنڈ سے ہجرت کے بعد میں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو آباد کرنے کے لیے ادھونی کی سرحد پر ایک غیر آباد علاقہ حاصل کیا تھا۔ اس علاقے سے چند میل کے فاصلے پر ایک گھنا جنگل ہے، اور اس جنگل سے آگے ایک چھوٹا سا دریا ہے۔ جو ادھونی اور مرہٹہ سلطنت کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے۔ ادھونی کی حکومت کی طرف سے ہمیں اس بات کی اجازت تھی کہ ہم جتنا جنگل چاہیں آباد کر سکتے ہیں۔ اس جنگل میں کہیں کہیں بھیل لوگ آباد تھے، جو عام طور پر شکار پر گزاراہ کیا کرتے تھے، مین نے ان لوگون میں کھیتی باڑی کا شوق پیدا کر کے انھیں کام پر لگا دیا۔ اور چند سال میں جنگل کاٹ کر بہت سی زمین آباد کر لی، میرے قبیلے کے لوگوں کی بستیون کے اردگردان

بھیل کسانوں کے گاؤں آباد ہو چکے تھے، جواب خوش حال انسانوں کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دن سرحد پاری مرہٹہ سردار کا ایلچی میرے پاس آیا، اور اس نے مجھے پیغام دیا۔ کہ اگر آپ لوگ اس علاقے میں امن کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں ہر سال اپنی آمدنی کا ایک چوتھائی ادا کرتے رہیں، یہ مطالبہ میرے نزدیک ایک گالی تھا، اور میں نے سردار کے ایلچی کو ڈانٹ ڈپٹ کر واپس کر دیا۔

چند ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ مرہٹہ سردار کی دھمکیوں سے مرعوب ہو کر بعض کسان مجھ سے بالا، بالا انھیں چوتھا حصہ دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں، میں نے ایک دن علاقے کے تمام بھیل جمع کیے، اور ان سے یہ وعدہ لیا کہ وہ مرہٹوں کو ایک کوڑی بھی ادا نہیں کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹوں نے ایک دن دریا عبور کر کے ان لوگوں کی چند بستیاں لوٹ لیں، اور چند مردوں اور عورتوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے، میں نے ان آدمیوں کو چھڑانے کے متعلق مرہٹہ سرداروں سے بات چیت شروع کی تو اس نے ایک بھاری رقم کا مطالبہ کیا، بھیل اپنے مال مویشی بیچ کر یہ رقم فراہم کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن میں نے ایک رات تین سو آدمیوں کے ساتھ دریا عبور کیا، اور مرہٹہ سردار کے گاؤں پر حملہ کر دیا، سردار ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی لڑائی میں مارا گیا، اور باقی دو بھائی، ایک بیٹا اور چند رشتے دار اور نوکر ہم نے زندہ گرفتار کر لیے۔ اس کے بعد مصالحت کی گفتگو شروع ہو ئی، اور سردار نے اپنے آدمیوں کے بدلے ہمارے آدمی چھوڑ دیے۔ اس کے بعد کافی دیر تک امن رہا، تاہم میں نے کسی غیر متوقع حملے کے پیش نظر اپنے مزارعین کو مسلح کر دیا۔ اور اب بھیل جنھیں عام طور پر بزدل خیال کیا جاتا تھا، اچھے خاصے سپاہی بن چکے تھے، کئی بار مرہٹہ سردار نے اپنے ایلچی بھیج کر اس بات پر احتجاج کیا،

کہ میں ان لوگوں کو مسلح کرکے اس کے علاقے کے لیے خطرہ پیدا کر رہا ہوں

لیکن مین ہمیشہ اسے یہی جواب دیتا کہ جب تک تمہاری طرف سے کوئی شرارت نہیں ہوگی ، یہ لوگ تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔

پچھلے سال میں نے اپنے گاؤں سے چند میل دور ایک نئی زمین آباد کرنے کے لئے جنگل کٹوانا شروع کیا، ایک صبح میں اور شہباز مزدوروں کے کام کی نگرانی کے لیے گھوڑوں پر سوار ہو کر گھر سے نکلے، گاؤں سے باہر ثمینہ بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی ۔وہ ہمارا، راستہ روک کر کھڑی ہو گئی کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو، ثمینہ کو سواری کا بہت شوق تھا اور کبھی ، کبھی جب کہیں نزدیک جانا ہوتا تو میں اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا کرتا ہوں، لیکن اس مرتبہ ہم دور جا رہے تھے، اور میں نے اسے بہت سمجھایا کہ تھک جاؤ گی ۔ایسے موقعہ پر آنسو اس کا سب سے خطرناک حربہ ثابت ہوا کرتے ہیں، چنانچہ شہباز نے اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا، شام سے کچھ دیر پہلے ہم اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس آرہے تھے کہ اچانک تھوڑی دور پر گھنے درختوں کی اوٹ سے ہم پر یکے بعد دیگرے چند فائر ہوئے، میرا گھوڑا زخمی ہو کر گر پڑا، اور اس کے ساتھ ہی ایک گولی میری ٹانگ میں لگی، میں اپنی بندوق سنبھال کر پاس ہی ایک گرے ہوئے درخت کی آڑ میں لیٹ گیا، شہباز مجھ سے چند قدم آگے تھا، اس نے فوراً گھوڑا روکا، اور ثمینہ سمیت نیچے کود پڑا، ثمینہ اس کا اشارہ پا کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں لیٹ گئی ۔اور وہ بھاگ کر میرے قریب آ گیا، حملہ آور سامنے درختوں میں چھپے ہوئے تھے

اور مجھے یقین تھا کہ وہ اچانک باہر نکل کر ہم پر ٹوٹ پڑیں گے ۔اچانک ہمیں اپنے عقب سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی ۔میں نے مڑ کر دیکھا تو ثمینہ گھوڑے کی

زین کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی اور وہ پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا، میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ثمینہ گھر میں ایک چھوٹے سے ٹٹو پر سواری کیا کرتی تھی، لیکن اس کا گھوڑے پر سوار ہونا اور اسے اس طرح بھگانا میرے لئے ایک معجزہ تھا۔ ہمیں زیادہ دیر تک ثمینہ کے متعلق سوچنے کا موقع نہ ملا۔ درختوں کے جھنڈ سے اچانک گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ اور ہم نے جوابی فائر شروع کر دیے۔ پھر تھوڑی دیر بعد دشمن کی بندوقیں خاموش ہو گئیں۔ اور کسی نے بلند آواز میں کہا اکبر خاں اب تم بچ کر نہیں جا سکتے، اب لڑائی بے سود ہے۔ لیکن اگر تم ہتھیار پھینک دو تو تمہاری جان بچانے کا وعدہ ہم کرتے ہیں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور دشمن نے دوبارہ گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ دشمن دن کی روشنی میں درختوں کی آڑ سے ہم پر حملہ نہیں کرے گا۔ لیکن شام کی تاریکی سے وہ پورا فائدہ اٹھائیں گے۔

ثمینہ کے متعلق میرا یہی خیال تھا کہ وہ شاید خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ گئی ہے۔ لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ غروب آفتاب کے وقت میں نے شہباز سے کہا کہ تھوڑی دیر بعد تاریکی چھا جائے گی۔ اور تمہیں اس سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں دشمن کو اپنی طرف متوجہ رکھوں گا۔ لیکن وہ ایسا مشورہ سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ پھر جب تاریکی چھا رہی تھی اور ہم یہ محسوس کر رہے تھے کہ دشمن اچانک درختوں کی آڑ سے نکل کر ہم پر حملہ کر دے گا۔ تو ہمیں دور سے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ اور تھوڑی دیر میں ایک بستی کے اٹھارہ جوان ہماری مدد کو پہنچ گئے۔ یہ ثمینہ کا کارنامہ تھا۔ وہ ڈر کر نہیں بھاگی تھی۔ خدا معلوم اس کے دماغ میں یہ بات کیسے آ گئی کہ ہم زیادہ دیر دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

وہ قریب ترین بستی کے لوگوں کو خبردار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن راستے کی پہلی بستی میں وہ گھوڑا روک نہ سکی۔ اور جب وہ دوسری بستی آئی تو وہ سرکش گھوڑے کو روکنے کی بجائے دھان کے ایک کھیت میں کود پڑی اور اتنی دہائی مچائی کہ آن کی آن سارا گاؤں اس کے گرد جمع ہوگیا۔ بھائی جان وہ عجیب لڑکی ہے۔ تنویر کی یہ حالت ہے کہ وہ چھپکلی سے ڈرتی ہے۔ اور ثمینہ نے سات سال کی عمر میں کوئی دو گز لمبا سانپ مار ڈالا تھا۔

فرحت نے کہا۔ "اچھا ان حملہ کرنے والوں کا پھر کیا بنا؟"

"وہ سواروں کو دیکھتے ہی بھاگے۔ ہم نے ان کا تعاقب کر کے دو آدمیوں کو مار ڈالا اور ایک کو زندہ گرفتار کرلیا۔ اس کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ وہ یہ آدمی جن کی تعداد آٹھ تھی۔ سرحد پار سے مرہٹہ سردار نے مجھے قتل کرنے کے لیے بھیجے تھے۔"

فرحت نے پوچھا "اور اب اس کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟"

"اس کے بعد کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ادھونی کی حکومت کے احتجاج پر پونا کی حکومت نے مرہٹہ سردار سے سخت باز پرس کی تھی۔"

تیسرے روز فرحت صبح کی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہی تھی، مراد علی کمرے میں داخل ہوا، اور کچھ دیر اس کے پاس کھڑا رہا، فرحت دعا سے فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئی، مراد علی نے کہا، امی جان چچا جان اکبر سفر کے لیے تیار ہیں۔ اور آپ سے رخصت کی اجازت چاہتے ہیں۔

اچھا انہیں اندر لے آؤ۔

مراد علی واپس چلا گیا اور فرحت کمرے سے نکل کر صحن میں آگئی، تھوری دیر بعد

اکبرخان اور مراد خان صحن میں داخل ہوئے۔

اکبرخان نے کہا اب مجھے اجازت دیجیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں انور علی سے نہیں مل سکا۔ آپ مراد اور انور کو کسی دن میرے پاس بھیجنے کا وعدہ نہ بھولیں،

فرحت نے کہا اگر حالات نے اجازت دی تو میں انہیں ضرور بھیجوں گی،

اکبرخان نے گھٹی ہوئی آواز میں خدا حافظ کہا، اور مراد علی کے ساتھ چل پڑا۔

فرحت بے حس و حرکت کھڑی زندگی کی ان رنگینیوں کا تصور کر رہی تھی، جو ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہو چکی تھیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ اکبرخان کی رفاقت کا زمانہ اسے ایک خواب معلوم ہوتا تھا۔

باہر دیوان خانے کے سامنے کریم خاں، اکبرخاں کے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ مراد کے اشارے سے وہ ان کے پیچھے چل دیا، ڈیوڑھی سے نکل کر تھوڑی دور سڑک پر چلنے کے بعد اکبرخان رکا، اور اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ مراد اب تمہیں آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ خدا حافظ۔

مراد علی نے اس کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا، چچا جان شہباز اور چچی جان کو میرا سلام کہیے۔

بہت اچھا اکبرخان نے یہ کہہ کر نوکر سے باگ پکڑی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

چچا جان: مراد علی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ بہن تنویر اور ثمینہ کو بھی میرا سلام کہیے۔

اکبرخان نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا بہت اچھا خدا حافظ۔

خدا حافظ چچا جان

گھوڑا چند چھلانگیں لگانے کے بعد پاس ہی سڑک کے موڑ پر اوجھل ہو گیا۔

اور مراد علی کریم خان کے ساتھ واپس ہو گیا۔ جب وہ ڈیوڑھی کے قریب پہنچے، تو منور پوری رفتار سے بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ اور اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا بھائی جان مہمان چلے گئے۔ مراد نے جواب دیا ہاں لیکن تم اس قدر بد حواس کیوں ہو؟

منور نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ بھائی جان کریم ہمیشہ میرے ساتھ دشمنی کرتا ہے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں جگا دوں گا۔

کریم خان نے کہا ارے میں نے تمہیں آواز دی تھی لیکن تم گدھے کی طرح خراٹے لے رہے تھے۔

منور نے فریادی ہو کر کہا بھائی جان یہ جھوٹ بولتا ہے میں کبھی خراٹے نہیں لیتا۔

مراد علی نے کہا اچھا یہ بتاؤ کہ مہمان کے ساتھ تمہارا کیا کام تھا؟

جی میں انہیں سلام کرتا۔ دیکھیے کل انھوں نے مجھے ایک مُہر دی تھی۔ یہ خالص سونے کی ہے۔

میں نے بی بی جی کو بھی دکھائی تھی، کریم بخش مجھ سے جلتا تھا اس لئے مجھے نہیں جگایا، منور نے اشرفی نکال کر انور علی کو دکھائی۔ کریم خاں نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو اشرفیاں نکال کر منور کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ابے مجھے جلنے کی کیا ضرورت تھی۔ خاں صاحب تم سے پہلے مجھے دو مہریں دے چکے ہیں۔ اور چوکیدار کو بھی ایک مہر دے گئے ہیں۔

منور نے منھ بسور کر اشرفی اپنی جیب میں ڈالی اور مراد علی ہنستا ہوا ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔

دوسرا باب

ایک دوپہر پانڈی چری کی بندرگاہ پر لوگوں کا ہجوم ایک فرانسیسی جہاز سے اترنے والے مسافروں کا خیر مقدم کر رہا تھا، جہاز کے ملاح اور بندرگاہ کے مزدور سامان اتارنے میں مصروف تھے، اور چند سپاہی تماشائیوں کو بندرگاہ کے احاطے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جہاز کا کپتان ایک طرف کھڑا چند فرانسیسی حکام سے اور فوجی افسروں سے باتیں کر رہا تھا، اور اس کے پاس ہی ایک سائبان کے نیچے ایک محرر میز لگائے بیٹھا تھا۔ اور اس کے ساتھ چند حبشی اور یورپین، جن میں سے بعض کے لباس نکبت اور افلاس کے آئینہ دار تھے، ایک نصف دائرہ میں کھڑے تھے۔ محرر کی کرسی کے دائیں اور بائیں دو نوجوان جو اپنے لباس سے پانڈی چری کی بجائے میسور کی فوج کے سپاہی معلوم ہوتے تھے، کھڑے تھے، ایک دراز قامت اور خوش وضع نوجوان تماشاہیوں کے ہجوم میں اپنا راستہ صاف کرتا ہوا آگے بڑھا، اور محرر اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا،

نوجوان نے ایک ثانیہ کے لئے سائبان میں جمع ہونے والے آدمیوں کی طرف دیکھا، اور پھر محرر کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا، اس جہاز پر صرف یہی آدمی آئے ہیں۔

جی ہاں جہاز کے کپتان نے مجھے بتایا ہے کہا گلے مہینے مریشس سے دوسرا جہاز آئے گا۔

ان گیارہ آدمیوں میں سے پانچ یورپین اور باقی افریقی ہیں۔ خدا معلوم جہاز کا کپتان انہیں کہاں سے پکڑ لایا ہے۔ ان میں کوئی بھی فوجی تجربہ نہیں رکھتا۔

نوجوان ان آدمیوں کی طرف متوجہ ہوا اور فرانسیسی زبان میں بولا۔ ''ہمیں میسور کی فوج کے لیے بہترین آدمی درکار ہیں۔ میں تمہاری حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا لیکن تم میں سے کسی کو اگر یہ غلط فہمی ہے کہ میسور کی فوج بے کار لوگوں کی جائے پناہ ہے تو یہ غلط فہمی ابھی سے دور ہو جانی چاہیے۔

میسور کی فوج میں شامل ہونے سے پہلے تمہیں ابتدائی تربیت کے انتہائی صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ تم میسور کے حکمران کو ہر اچھے سپاہی کا بہترین قدر دان پاؤ گے۔ ابتدائی تربیت کے لیے تمہیں چند ہفتے یہاں رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد جو لوگ فوجی خدمت کے قابل سمجھے جائیں گے انہیں میسور بھیج دیا جائے گا اور باقی کو ایک ماہ کی زائد تنخواہ دے کر واپس کر دیا جائے گا۔''

پیچھے سے کسی کی آواز سنائی دی مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ آپ کی بہترین توقعات پوری کر سکیں گے۔ یہ سیر و تفریح کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے ایک نئی زندگی کی تلاش میں آئے ہیں''۔

نوجوان نے مڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے جہاز کا عمر رسیدہ کپتان اور چند فرانسیسی افسر کھڑے تھے۔

''موسیو فرانسسک''! نوجوان نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

کپتان فرانسسک نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔'' انور علی مجھے تمہاری توقع نہ تھی تم کب سے یہاں ہو؟''

ایک فرانسیسی افسر نے کہا۔'' آپ ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہیں''

انور علی نے جواب دیا۔'' کپتان فرانسسک سرنگا پٹم کی فوجی درس گاہ میں

ہماری اُستاد رہ چکے ہیں۔ میں نے فرانسیسی زبان انہی سے سیکھی تھی۔''

کپتان فرانسسک نے پوچھا۔''آپ کے والد اور بھائیوں کا کیا حال ہے؟''

انور علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔''بھائی صدیق، مسعود اور ابا جان بڈ نور کی جنگوں میں شہید ہو گئے تھے۔ مراد سرنگا پٹم میں تعلیم پا رہا ہے۔

''مجھے افسوس ہے۔'' کپتان فرانسسک نے مغموم لہجے میں کہا۔'' معظم علی میرے بہترین دوست تھے۔

انور علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔'' آپ پانڈی چری میں کتنے دن قیام کریں گے؟''

''میں یہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہروں گا مجھے آپ سے بہت باتیں کرنی ہیں۔ آپ کا قیام کس جگہ ہے؟''

انور علی نے بندرگاہ سے کوئی ڈیڑھ سو قدم دور چند خیموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''وہ میرا کیمپ ہے۔ اگر آپ رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔''

ایک فوجی افسر نے کہا۔'' کھانے پر یہ نہیں آسکیں گے۔ آج رات گورنر کے ہاں دعوت ہے۔''

فرانسسک نے کہا۔'' اگر آپ سو نہ گئے تو گورنر کی دعوت سے فارغ ہوتے ہی میں آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔''

انور علی مسکرایا۔'' میرے سو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ضرور تشریف لائیے۔''

''میں ضرور آؤں گا۔ مجھے آپ کے ساتھ ایک ضروری کام بھی ہے۔''

☆☆

رات کے گیارہ بجے انور علی نے کپتان فرانسسک کی آمد سے مایوس ہو کر سونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دلاور خان خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ ''جناب کپتان صاحب آگئے ہیں۔''

انور علی اپنی کرسی سے اٹھا اور خیمے سے باہر نکل آیا کپتان فرانسسک ایک اور آدمی کے ساتھ اوپر کھڑا تھا اس نے آگے بڑھ کر انور علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا میرا خیال تھا کہ آپ سو گئے ہوں گئے گورنر کی دعوت پر مجھے چند پرانے دوست مل گئے اور ان کے ساتھ باتوں میں بہت دیر لگ گئی، پھر آپ کے پاس آنے سے پہلے میرا اپنے جہاز پر جانا بھی ضروری ہے۔

انور علی نے کہا میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید آپ اس وقت نہ آئیں پہلے اندر بیٹھتے ہیں۔

کپتان فرانسسک انور علی کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا لیکن اس کا ساتھی تذبذب کی حالت میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ فرانسسک نے مڑ کر باہر جھانکتے ہوئے کہا لیگر انڈ آؤ تم باہر کیوں کھڑے ہو؟

کپتان کا ساتھی خیمے کے اندر داخل ہوا وہ کوئی بیس سال کا دبلا پتلا نوجوان تھا اس کے خدوخال میں ایک غیر معمولی جاذبیت تھی تاہم اس کی جھکی ہوء گردن اور مغموم اداس اور ملتجی نگاہیں کسی جسمانی اور ذہنی اذیت کا پتہ دے رہی تھیں۔

فرانسسک نے انور علی کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا بھیا بیٹھ جاؤ تمھارے لئے یہ خیمہ میرے جہاز سے زیادہ محفوظ ہے

پھر وہ انور علی کی طرف متوجہ ہوا پانڈی چری پہنچ کر میرے لئے سب سے بڑا

مسئلہ اس نوجوان کے لئے جائے پناہ تلاش کرنا تھا۔

انور علی نے کہا اگر کوئی خطرہ ہے تو میں انہیں اسی وقت سرنگا پٹم بھیجنے کا انتظام کرسکتا ہوں۔

فرانسسک نے کہا اگر اسے صرف سرنگا پٹم بھیجنے کا سوال پیدا ہوتا تو میرے لئے کوئی پریشانی کی بات نہ تھی لیکن بعض وجوہات کے باعث اسے کچھ عرصہ یہیں رہنا پڑے گا۔ پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ اسے اپنے کسی فرانسیسی دوست کے پاس چھوڑ دوں گا پانڈی چری کی فوج کے کئی افسر ایسے ہیں جن کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات ہیں لیکن پیرس کی پولیس اسے تلاش کر رہی ہے اور کوئی فرانسیسی اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالے بغیر اس کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکے گا۔

اسے ایک لڑکی کے انتظار کیلئے یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ اور جب وہ یہاں پہنچ جائے گی تو یہ اس کے ساتھ میسور چلا جائے گا یہ کچھ عرصہ پیرس کے فوجی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر چکا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کے لیے سلطان ٹیپو کی فوج کے یورپین دستے میں کوئی معقول عہدہ حاصل کرنا مشکل نہ ہوگا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ اسے اپنے ایک نجی ملازم کی حیثیت سے یہاں رکھیں۔ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا باپ میرا دوست تھا۔ کہیں آپ یہ خیال نہ کریں کہ میں کسی عادی مجرم کو آپ کی پناہ میں دینا چاہتا ہوں۔ میری نظر میں یہ بالکل بے گناہ ہے۔ اور جو واقعات اسے پیش آئے ہیں، وہ فرانس میں ہر شریف آدمی کو پیش آسکتے ہیں۔

انور علی نے کہا۔ ''میرے لیے یہی کافی ہے کہ آپ انہیں میری اعانت کا مستحق سمجھتے ہیں میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں آخری دم تک ان کی حفاظت کروں گا

اور یہ ایک ملازم کی حیثیت میں نہیں بلکہ ایک دوست کی حیثیت میں میرے پاس رہے گا۔"

فرانسسک نے نوجوان کی طرف دیکھا اور کہا بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ پیرس کی پولیس تمہیں یہاں تک تلاش کرے گی ۔لیکن پھر بھی تمہیں بہت محتاط رہنا چاہیے یہاں اپنے کسی ہم وطن کے ساتھ میل جول رکھنا تمھارے لئے مفید نہ ہوگا تمہیں ہر وقت یہی محسوس کرنا چاہیے کہ اس خیمے سے باہر تمہارے لئے ہر جگہ غیر محفوظ ہے اور اس کے بعد میسور پہنچ کر بھی تمہارے لئے یہی بہتر ہوگا کہ تم اپنا اصلی نام کسی پر ظاہر نہ کرو۔

انور علی نے کہا انہیں یہاں کے کسی آدمی نے آپ کے سات آتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟

نہیں، یہاں پہنچ کر میں نے اسے جہاز سے باہر جھانکنے کی بھی اجازت نہیں دی اور اب بھی جب بندرگاہ کے پہرے داروں نے اسے میرے ساتھ آتے دیکھا ہے وہ یہی سمجھتے ہوں گے کہ یہ میرے ملاحوں میں سے ایک ہے راستے میں جہاز کے مسافروں کو بھی اس کے متعلق یہی معلوم تھا کہ یہ جہاز کے عملہ سے تعلق رکھتا ہے خدا کا شکر ہے کہ بندرگاہ پر آپ سے ملاقات ہوگئی ورنہ اس کے متعلق بہت پریشان تھا

انور علی نے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا دیکھیے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں میں آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں ۔

نوجوان نے ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ انور علی کی طرف دیکھا اور کہا مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوگی۔

کپتان فرانسسک نے کہا اب میں میسور کے متعلق آپ چند باتیں کرنا چاہتا ہوں آج گورنر کی دعوت پر قریباً تمام وقت کورگ اور نرگنڈ میں سلطان ٹیپو کی فتوحات ہماری گفتگو کا موضوع بنی رہی اور میں بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتا رہا کہ مجھے کسی قیمت پر میسور کی ملازمت چھوڑنی نہیں چاہئے تھی مجھے ماریشیش پہنچ کر حیدر علی کی وفات کی اطلاع ملی تھی اور میں فرانس جانے کی بجائے واپس آنا چاہتا تھا لیکن ماریشش میں ایک طویل علالت کے باعث میری یہ خواہش پوری نہ ہوسکی علالت کے ایام میں میری تمام دلچسپیاں میسور کی عزت اور آزادی میری عزت اور آزادی ہے میں میسور کی فوج کی ہر شکست کو اپنی شکست اور ہر فتح کو اپنی فتح سمجھتا تھا پھر جب میں مارسیلز پہنچا تو وہاں ہر مجلس میں ٹیپو کی فتوحات کے چرچے ہو رہے تھے جن لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ میں میسور کی حکومت کا ملازم رہ چکا ہوں وہ مجھ سے عجیب و غریب سوالات کرتے تھے۔ٹیپو کیسا ہے؟______ اس کی عمر کیا ہے؟ ______ اس کے چہرے کے خدوخال کیسے ہیں؟______ تم نے کبھی اسے قریب سے دیکھا ہے؟ ______ کبھی اس کے ساتھ بات کی ہے؟______ اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں ٹیپو کو اس وقت سے جانتا ہوں جب انہوں نے میسور کی فوج میں اپنا پہلا عہدہ سنبھالا تھا

اور میں ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہوں جنہیں ہر مہینے دو چار مرتبہ ان سے مصافحہ کرنے اور ہمکلام ہونے کا موقع ملتا تھا اور وہ مجھ سے فرانس کی تاریخ اور فرانس کے جغرافیہ کے متعلق بے شمار سوال پوچھا کرتے تھے،تو سننے والوں کو میری باتوں کا یقین نہ آتا تھا مجھے بہت جلد واپس جانا ہے ورنہ میں سلطان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ آج گورنر کے ساتھ گفتگو کے دوران میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ

مرہٹے اور نظام میسور کے خلاف متحد ہو رہے ہیں اور اگر سلطان کو کئی محاذوں پر لڑنا پڑے گا مجھے یقین ہے کہ صلح نامہ منگلور کے بعد بھی میسور کے خلاف انگریزوں کے جارحانہ عزائم مین کوئی فرق نہیں آیا وہ اپنی سابقہ شکستوں کا انتقام لینے کیلئے صرف موزوں وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔

انور علی نے کہا۔" ہمیں انگریزوں کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے نظام اور مرہٹوں کی اعانت کی امید پر جنگ شروع کی تھی۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ معاہدہ منگلور کے بعد میسور کے خلاف جتنی سازشیں ہوئی ہیں اُن سب میں انگریز، نظام اور مرہٹے برابر کے حصہ دار ہیں۔لیکن ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ اگر نظام اور مرہٹوں نے انگریزوں کی شہ پر جنگ شروع کی تو ہم انگریزوں کے میدان میں آنے سے پہلے ہی انہیں پیس کر رکھ دیں گے۔انگریز منگلور اور بدنور کی جنگوں میں اس قدر مفلوج ہو چکے ہیں کہ انہیں دوبارہ میدان میں آنے کے لیے کافی عرصلہ لگے گا اور ہم جنگ کو طول دے کر انہیں تیاری کا موقع دینے کی غلطی نہیں کریں گے۔سرِ دست سلطان معظم، نظام اور مرہٹوں کو جنگ سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔لیکن اگر انہوں نے ہمارے لیے جنگ کے سوا کوئی راستہ باقی نہ چھوڑا تو آپ دیکھیں گے کہ نظام اور نانا فرنویس اس دن کو اپنی تاریخ کا منحوس ترین دن خیال کریں گے۔ جب انہوں نے انگریزوں کی اعانت کی امید پر میسور سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ہمیں صرف اس بات کا افسوس ہے کہ ہمارے فرانسیسی حلیفوں نے ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔اگر منگلور کی جنگ کے ایام میں فرانسیسی فوج ہم سے علیحدہ نہ ہو جاتی تو آج ہمیں ان حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا"

کپتان فرانسسک نے کہا۔ "میں اس مسئلہ میں فرانس کی وکالت نہیں کروں گا یہ ایک ایسی غلطی تھی جس پر مستقبل کے مورخ ہمیں ہمیشہ ملامت کرتے رہیں گے۔"

انور علی نے کہا۔ "لیکن اب بھی فرانس اگر حقیقت پسندی کا ثبوت دے تو سابقہ غلطیوں کی تلافی ہوسکتی ہے۔"

فرانسسک نے جواب دیا۔ "کاش آپ کو فرانس کے حالات کا صحیح علم ہوتا۔ انگریزوں کے ساتھ ہماری صلح کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہم ان کی امن پسندی کے قائل ہو گئے تھے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے۔ آج فرانس کے اندرونی حالات اس قابل نہیں کہ وہ اپنی خارجہ سیاست کے میدان میں کوئی حقیقت پسندانہ قدم اٹھا سکے۔ اگر میں سلطان ٹیپو کی خدمت میں حاضر ہوسکتا تو میں غیر مبہم الفاظ میں اپنی موجودہ حکومت کی ان کمزوریوں کا اعتراف کرتا جن کے باعث ہم اپنے حلیفوں کو کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ فرانس کا ہر باشعور آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ مشرق میں صرف میسور ایک ایسی قوت ہے جو انگریزوں کی جارحیت کا مقابلہ کرسکتی ہے لیکن کاش ایسے لوگوں کی آواز ہمارے حکمرانوں کو متاثر کرسکتی! میں موجودہ حالات میں فرانس کے مستقبل سے مایوس ہو چکا ہوں لیکن میسور کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوا۔ میرے ہم خیال لوگ اپنی بساط کے مطابق اس بات کی ہر ممکن کوشش کرر ہے ہیں۔ کہ فرانس ہندوستان میں سلطان ٹیپو کا پورا پورا ساتھ دے لیکن کاش وہاں بھی کوئی حیدر علی یا ٹیپو ہوتا۔"

انور علی مسکرایا۔ "آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے ایک بڑا آدمی ایک بڑی احتیاج کی پیداوار ہوتا ہے۔"

کپتان فرانسسک کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "خدا خیر کرے کہ فرانس کو سلطان ٹیپو جیسا رہنما مل جائے۔ اور جب میں دوسری بار یہاں آؤں تو آپ کو یہ خوش خبر دے سکوں کہ میرے پیچھے ایک عظیم ترین جنگی بیڑا آرہا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں چند بیکار آدمی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ آپ کو یقیناً مایوسی ہوئی گی۔"

انور علی نے جواب دیا۔ "میں سلطان ٹیپو کا سپاہی ہوں اور مایوسی میرے نزدیک ایک گناہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ان آدمیوں کو کارآمد بنا سکیں گے۔"

لیکن میں حیران ہوں کہ اس کام کے لیے آپ کو کیوں منتخب کیا گیا ہے۔ آپ کو کوئی اہم ذمہ داری سونپی جانی چاہیے تھی۔ اور پھر آپ کے لیے پانڈی چری کی بجائے مغربی ساحل کی کسی بندرگاہ سے اسلحہ اور سپاہی حاصل کرنا آسان ہے۔"

"ہم باہر سے جو اسلحہ منگواتے ہیں وہ تو عام طور پر منگلور کی بندرگاہ پر ہی اترتا ہے۔ میں درحقیقت پانڈی چری میں اپنی حکومت کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ یہاں پہنچ کر مجھے چند ایسے یورپین مل گئے جو روزگار کی تلاش میں بھٹک رہے تھے اور میں نے انہیں چند دن فوجی تربیت دے کر میسور بھیج دیا۔ اس کے بعد مجھے حکم آیا کہ میں باقاعدہ بھرتی کا ایک دفتر کھول دوں۔ اور میں اس بات پر خوش ہوں کہ مجھے بیکاری کے دن گزارنے کے لیے ایک مشغلہ مل گیا ہے۔ مجھے کورگ کے محاذ سے یہاں بھیجا گیا تھا اور ذاتی طور پر میں اس بات پر خوش نہ تھا۔ لیکن میرے یہاں بھیجے جانے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں فرانسیسی زبان جانتا تھا اور دوسری یہ کہ کورگ کی چند جنگوں میں میں نے بے احتیاطی یا ضرورت سے زیادہ جرات کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک دن سپہ سالار برہان الدین نے مجھے بلا کر کہا کہ کورگ کی جنگ اب قریباً ختم ہو چکی ہے

اور میری یہ خواہش ہے کہ تم اس سے زیادہ اہم معرکوں میں حصہ لینے کے لیے زندہ رہو۔ سلطان کسی ذہین آدمی کو پانڈی چری بھیجنا چاہتے ہیں اور میں نے تمہارا نام پیش کر دیا ہے ___ مجھے یہاں آکر بہت مایوسی ہوئی ہے۔ پانڈی چری کے گورنر سے لے کر معمولی افسر تک یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انگریزوں کے عزائم کے متعلق ہمارے خدشات صحیح ہیں اور جب جنگ کے لیے ان کی تیاریاں مکمل ہو جائیں گی تو معاہدہ وارسیلز کی حیثیت ردی کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ نہیں ہو گی۔ لیکن جب فرانس اور میسور کے درمیان عملی تعاون کا مسئلہ زیرِ بحث آتا ہے تو ان سب کا یہی جواب ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ہم بے بس ہیں۔ جب تک انگریزوں کی طرف سے پہل نہیں ہوتی، فرانس کی حکومت معاہدہ وارسیلز کی خلاف ورزی نہیں کرے گی۔"

فرانسسک نے کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ فرانس کی حکومت انگریزوں کی طرف سے پہل کے بعد بھی دیکھو اور انتظار کرو۔" کی پالیسی پر کاربند رہے گی۔ میں نے آج گورنر کے ساتھ باتوں میں اندازہ لگایا ہے کہ وہ سلطان ٹیپو کے ساتھ تعاون کے پُرزور حامی ہیں۔ لیکن فرانس کے اندرونی حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ آپ کو وہاں سے کسی امداد کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔"

انور علی اور کپتان فرانسسک قریباً دو گھنٹے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ بالآخر کپتان فرانسسک نے اٹھتے ہوئے کہا۔ " اب بہت زیادہ دیر ہو گئی ہے مجھے اجازت دیجیے اگر فرصت ملی تو میں کل دوبارہ ملنے کی کوشش کروں گا۔"

انور علی اُٹھ کر کپتان فرانسسک کے ساتھ خیمے سے باہر نکلا اور لیگرانڈ بھی ایک ثانیہ توقف کے بعد اُن کے پیچھے ہو لیا۔ خیمے سے باہر نکل کر کپتان فرانسسک

نے کہا۔" آپ آرام کیجیے۔"

انور علی نے کہا۔"میں بندرگاہ تک آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

"نہیں" اس تکلف کی ضرورت نہیں، آپ آرام کریں"۔

دو پہرے دار چند قدم دور کھڑے تھے۔ انور علی نے ان میں سے ایک کو کپتان فرانسسک کے ساتھ بندرگاہ تک جانے کا حکم دیا۔

فرانسسک نے یکے بعد دیگرے انور علی اور لیگر انڈ سے مصافحہ کیا اور پہرے دار کے ساتھ چل دیا۔

"آیئے! انور علی نے لیگر انڈ کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔"

جب وہ واپس خیمے میں داخل ہوئے تو انور علی نے کہا۔"دیکھیے اس وقت آپ کے لیے علیحدہ خیمہ نصب کرنے میں دیر لگے گی۔ اس لیے آج رات آپ کو میرے ساتھ گزارہ کرنا پڑے گا۔"

لیگر انڈ نے جواب دیا۔"مجھے علیحدہ خیمے کی ضرورت نہیں اور میں آپ کو بھی تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ میں آپ کے کسی نوکر کے ساتھ گزارہ کرلوں گا۔"

"نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

انور علی نے دلاور خاں کو ایک اور بستر لانے کو کہا اور تھوڑی دیر بعد یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب لیٹ گئے۔ انور علی کو لیگر انڈ کے ساتھ پہلی ملاقات میں جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ اس کی کرب انگیز خاموشی تھی۔ اس نے کہا۔" موسیو! مجھے یہ معلوم نہیں کہ پیرس میں آپ پر کیا بیتی ہے لیکن میں آپ کو یہ اطمینان دلا سکتا ہوں کہ یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔ اب آپ اطمینان سے سو جائیں مجھے یقین ہے کہ پانڈی چری کی حکومت عام حالت میں آپ پر کوئی خاص

توجہ نہیں دے گی۔ لیکن اگر کوئی فوری خطرہ پیش آیا تو میں آپ کو یہاں سے کسی محفوظ جگہ پہنچا دوں گا۔"

تشکر اور احسان مندی کے جذبات لیگرانڈ کے سینے میں مچل کر رہ گئے۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ "موسیو! آپ بہت رحمدل ہیں۔"

تیسرے دن کپتان فرانسسک کا جہاز روانہ ہو چکا تھا۔ لیگرانڈ کی شخصیت انور علی کے لیے ایک معمے سے کم نہ تھی۔اس نے اپنی زندگی میں اتنا کم گو نوجوان نہیں دیکھا تھا۔وہ اس کے ساتھ باتیں کرنے کی کوشش کرتا لیکن لیگرانڈ اس کے ہر سوال کا مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ اسکی مغموم صورت دیکھ کر انور علی کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے مگر اسے زیادہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

ایک دن آدھی رات کے قریب انور علی اپنے خیمے میں شور سن کر گہری نیند سے بیدار ہوا۔لیگرانڈ خواب کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔" یہ مر چکا ہے۔۔۔میں بے قصور ہوں۔۔میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔۔۔۔تم ظالم ہو۔۔۔خدا کے لیے مجھے میرے اسکول لے چلو۔۔جین جلدی کرو۔ہم یہاں سے نکل چلیں۔۔وہ آرہے ہیں ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ جلدی کرو۔بھاگو! بھاگو!!۔"

دلاور خاں مشعل ہاتھ میں لیے خیمے میں داخل ہوا۔ انور علی نے لیگرانڈ کی طرف دیکھا۔اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا اور اس کی حرکات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی خوفناک عفریت کی گرفت سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ انور علی جلدی سے اٹھ کر آگے بڑھا اور لیگرانڈ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑنے لگا۔ لیگرانڈ نے آنکھیں کھولیں اور ٹکٹکی باندھ کر انور علی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بڑی تیزی سے سانس لے رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" انور علی نے کہا۔" تم ٹھیک ہو نا؟" پھر وہ دلاور خاں کی طرف متوجہ ہوا۔"دلاور خاں تم بھاگ کر فنسٹن کمانڈر کے پاس جاؤ اور اسے کہو

کہ مجھے ایک تجربہ کار ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

لیگرانڈ نے کہا۔" نہیں نہیں موسیو، میں بالکل ٹھیک ہوں، مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں میں ایک بھیانک سپنا دیکھ رہا تھا، مجھے صرف پانی منگوا دیجیے۔"

انور علی نے دلاور خاں کو پانی لانے کے لیے کہا اور اس نے خیمے کے اندر پڑی ہوئی ایک صراحی سے کٹورا بھر کر لیگرانڈ کو پیش کر دیا۔ لیگرانڈ نے ہانپتے کانپتے پانی کا کٹورا حلق میں اُنڈیل لیا۔ اور انور علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔" موسیو میں بہت شرمسار ہوں، میں نے آپ کو بہت تکلیف دی ہے۔"

انور علی نے کہا۔" مجھے صرف اس بات کا ملال ہے کہ میں تمہاری تکلیف میں حصہ دار نہیں بن سکتا۔ میں نے عمداً تمہارا راز دار بننے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تمہیں کسی ایسے دوست کی ضرورت ہے جو تمہارے دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ جین کون ہے؟"

لیگرانڈ نے جواب دیا۔"موسیو! اگر میں نے آپ سے اپنا کوئی راز چھپانے کی کوشش کی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے آپ پر اعتماد نہ تھا۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے آپ کو پریشان کرنا گوارا نہ تھا۔ اب آپ اطمینان سے اپنے بستر پر لیٹ جائیے میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا۔"

انور علی نے دلاور خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔" دلاور خاں جاؤ تم آرام کرو۔"

دلاور خاں چلا گیا اور انور علی اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر خیمے کے اندر خاموشی طاری رہی بالآخر لیگرانڈ نے اپنی سرگزشت شروع کی۔" موسیو انور علی! قدرت نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے، میں آپ کو اپنی سرگزشت سناتا ہوں، میرا

اصلی نام لیمرٹ ہے، میں مارسیلز اور پیرس کے درمیان ایک چھوٹے سے شہر میں پیدا ہوا تھا۔ میرا باپ فرانس کی بحریہ کے ایک جہاز کا کپتان تھا۔ جب میں دس سال کا ہوا تو میرے باپ کو ایک مہم کے ساتھ ہندوستان آنا پڑا۔ والد کے آنے سے قریباً ایک سال بعد میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ گھر میں اب صرف میری ایک بہن تھی جو مجھ سے آٹھ سال بڑی تھی۔ ابا جان اڑھائی سال کے بعد واپس آئے۔ ہندوستان میں کسی جنگ میں زخمی ہونے کے باعث ان کا ایک بازو بیکار ہو چکا تھا۔ واپس آتے ہی انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور جو روپیہ انہوں نے ملازمت کے زمانے میں جمع کیا تھا اس سے ایک سرائے خرید لی۔ مارسیلز اور پیرس کے درمیان آنے جانے والے مسافروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور ہمارے لیے سرائے کا کاروبار کافی سودمند ثابت ہوا۔ چند سال بعد میرے ابا شہر کے امیر ترین آدمیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ سرائے کے اندر مسافروں کے لیے چند نئے کمروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ میری بہن کی شادی فوج کے ایک لیفٹیننٹ کے ساتھ ہو چکی تھی اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ مریشس جا چکی تھی۔ میں پیرس کے نزدیک ایک فوجی اسکول میں داخل ہو چکا تھا۔ میرے ابا کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں فرانس کی فوج میں کوئی بڑا عہدہ حاصل کروں اور میں بھی اپنے مستقبل کے متعلق کم پُرامید نہ تھا۔ لیکن آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایک انسان سپنے دیکھ سکتا ہے مگر سپنوں کی تعبیر اس کے اختیار میں نہیں ہوتی۔

میں موسمِ سرما کی تعطیلات میں گھر آیا ہوا تھا۔ گھر پر فرصت کے وقت میں سرائے کے کاروبار میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ میری چھٹی میں کوئی دس دن باقی تھے کہ ایک صبح ایک بگھی سرائے کے دروازے پر آ کر رکی۔ ابا جان ابھی گھر سے

نہیں آئے تھے۔ اور میں ان کی جگہ مسافروں کو خوش آمدید کہنے کے لیے باہر نکلا۔
ایک عمر رسیدہ نوجوان لڑکی کا سہارا لے کر بگھی سے اُتر رہا تھا۔ میں نے بھاگ کر عمر رسیدہ آدمی کا بازو تھام لیا۔ لڑکی نے کہا۔ ''میرے ابا کو راستے میں تکلیف ہو گئی ہے آپ فوراً کسی ڈاکٹر کو بلوائیں۔''

میں نے اپنے ایک نوکر کو شہر کے بہترین ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا اور مسافر کو سرائے کے ایک کمرے میں لٹا دیا۔ اس مُسافر کا نام موسیو انٹین تھا اور وہ پیرس کا ایک خوش حال تاجر تھا۔

لڑکی کا نام جین تھا۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ ''ڈاکٹر کا گھر کتنی دُور ہے ___ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی ___ اگر اس کا گھر زیادہ دُور تھا تو آپ نے اپنے نوکر کو پیدل بھگانے کی بجائے ہماری بگھی کیوں نا بھیج دی؟ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی کہ ڈاکٹر کا گھر بالکل قریب ہے وہ آہی رہا ہوگا۔

اچانک موسیو انٹین اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اُس نے کہا۔ ''بیٹی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میرے لیے یہ بیماری نئی نہیں، دیکھو اب میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔''

لڑکی چلائی'' نہیں نہیں ابا جان آپ آرام سے لیٹے رہیں'' موسیو انٹن مسکراتا ہوا دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر بھی پہنچ گیا۔ اس نے مریض کا معائنہ کرنے اور اسے چند سوالات پوچھنے کے بعد بتایا کہ انہیں دل کی بیماری ہے اور اب بظاہر کوئی خطرہ نہیں لیکن ایسی حالت میں انہیں سفر نہیں کرنا چاہیے۔ جین نے ڈاکٹر کی ہدایت کی تائید کی اور موسیو انٹن کو سفر کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔ لیکن کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ پیرس کے اس تاجر

اور اس کی بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی سے یہ ملاقات میری زندگی کا رخ بدل دے گی۔

موسیو! اینٹن اور اُس کی لڑکی مارسیلز میں اپنے کسی رشتہ دار کی شادی میں شرکت کے بعد واپس جا رہے تھے۔ جب انہیں پتا چلا کہ میں پیرس میں تعلیم پاتا ہوں اور میری چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں تو انہوں نے مجھے اپنی بگھی پر سفر کرنے کی دعوت دی اور میری خاطر ایک دن اور رک گئے۔ چنانچہ تیسرے دن میں ان کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

پیرس سے کوئی دس میل دور موسیو اینٹن کو ایک بار پھر دل کا دورہ پڑا اور ہمیں دو دن کے لیے راستے کی ایک سرائے میں اور قیام کرنا پڑا۔ عام حالات میں پیرس کے اُونچے طبقے کی ایک لڑکی شاید مجھے قابلِ توجہ نہ سمجھتی لیکن موسیو اینٹن کی علالت کے باعث میں اس کے لیے ایک بہت بڑا سہارا بن چکا تھا۔

سرائے میں دوسری رات موسیو اینٹن کی طبعیت ذرا زیادہ خراب تھی اور ہمیں کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھ کر جاگنا پڑا۔ پچھلے پہر اسے نیند آ گئی اور جین بھی اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ صبح کے وقت موسیو اینٹن نے آنکھیں کھولتے ہی میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ آج آپ کو ساری رات جاگنا پڑا۔“

میں نے پوچھا۔ ”اب آپ کا کیا حال ہے؟“

موسیو اینٹن نے جواب دیا۔ ”میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اب میرا ارادہ ہے کہ میں فوراً پیرس پہنچ کر کسی قابل ڈاکٹر سے علاج کراؤں۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی آپ کے لیے سفر کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں پیرس جا کر کسی اچھے ڈاکٹر کو یہاں لے آؤں۔“

موسیو اینٹن نے جواب دیا۔" اس بوسیدہ سرائے میں اگر دنیا کے تمام بہترین ڈاکٹر جمع ہو جائیں تو بھی مجھے آرام نہیں آئے گا۔ میں اب کسی تاخیر کے بغیر پیرس پہنچنا چاہتا ہوں۔"

ہماری باتیں سن کر جین بھی جاگ اٹھی اور اس نے بھی اپنے باپ کو سفر کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن موسیو اینٹن کا فیصلہ اٹل تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد ہم دوبارہ بگھی پر سوار ہو گئے۔ باقی سفر کے متعلق مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں نیند کی حالت میں کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف لڑھک رہا تھا۔ پھر جب میں گہری نیند سے بیدار ہوا تو بگھی ایک کشادہ مکان کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ جین مجھے سہارا دیے ہوئے تھی اور موسیو اینٹن مسکرا رہا تھا۔

"معاف کیجیے! میں نے جلدی سے ایک طرف ہٹ کر کہا۔"

بگھی رکی تو ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور موسیو اینٹن نے کہا۔" یہ میرا بیٹا ڈینس ہے۔"

موسیو اینٹن کے مکان میں داخل ہوتے وقت مجھے اس کی امارت کا صحیح اندازہ ہوا۔ میں نے کھانا کھانے کے بعد اُن سے اجازت لینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ سب میرا اسکول کھلنے تک مجھے اپنے ہاں ٹھہرانے پر مُصر تھے اور مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

جین کا بھائی ڈینس ایک ذہین اور کم گو نوجوان تھا۔ اور پیرس میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ان لوگوں سے مختلف تھا جو کسی اجنبی کے ساتھ فوراً گھل مل جاتے ہیں۔ چار دن بعد میں نے اپنے میزبانوں سے اجازت لی اور موسیو اینٹن سے وعدہ کیا کہ

میں چھٹی کے دن ان کے ہاں آیا کروں گا۔ اس کے بعد اسکول کے باہر میری سب سے بڑی دل چسپی موسیو اینٹن کا گھر تھا۔ ہمارا اسکول پیرس سے چند میل دور تھا۔ میں ہر مہینے ایک دو مرتبہ ہفتے کی شام اُن کے ہاں جاتا اور اتوار کے دن واپس آجاتا اور جب کبھی مجھے ہفتے کی شام پیرس جانے کا موقع نہ ملتا۔ میں اتوار کی صبح وہاں پہنچ جاتا۔ اور سارا دن وہاں گزارتا۔ ڈینس عام طور پر گھر سے غیر حاضر رہتا تھا۔ اور گھر میں کسی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اپنے کالج سے باہر اس کی مصروفیات کیا ہیں۔ مجھے یہ ماننے سے انکار نہیں کہ اس خاندان کے ساتھ میری وابستگی کی ایک بڑی وجہ جین تھی۔ لیکن مجھے اس بات کا پورا احساس تھا کہ زندگی میں ہمارے راستے کبھی ایک نہیں ہوسکتے۔ بے شک وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جنہیں ایک بار دیکھنے کے بعد بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن اگر میں اسے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتا تو یہ ایک پرلے درجے کی خود فریبی ہوتی۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آجایا کرتی ہے اور صرف یہ مسکراہٹ دیکھنے کے لیے ہی میں بڑی بے تابی کے ساتھ چھٹی کے دن کا انتظار کیا کرتا تھا۔

ایک دن میں نے موسیو اینٹن کے ہاں چند گھنٹے گزار کر رخصت کی اجازت طلب کی تو انہوں نے اصرار کیا کہ تم رات کا کھانا کھا کر جاؤ۔ میرا نوکر تمہیں بگھی پر چھوڑ آئے گا۔ شام سے کچھ دیر پہلے ڈینس اپنے کسی دوست سے ملنے کا بہانہ کرکے باہر نکل گیا۔ رات کے وقت ہم کھانے کے لیے اس کا انتظار کرتے رہے لیکن جب نو بج گئے تو ہم مایوس ہوکر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ موسیو اینٹن بے حد خفا تھا لیکن جین اپنے بھائی کی وکالت کررہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد موسیو

اینٹن کی تلخی دُور ہوچکی تھی اور وہ اپنی عادت کے مطابق بات بات پر قہقہے لگا

رہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے اجازت مانگی تو اس نے کہا۔ "تھوڑی دیر اور بیٹھو، میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ اگلے مہینے کی دسویں تاریخ کو جین کی منگنی کے سلسلے میں میرے ہاں دعوت ہے۔ اس میں تمھارے شرکت ضروری ہے۔"

میں نے جین کی طرف دیکھا، لیکن میرے لیے اس کے چہرے سے اُس کے احساسات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میری آواز میرے قابو میں نہ تھی اچانک باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔

۔ڈینس اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے دبائے لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور منہ کے بل گر پڑا۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر ڈینس کو سہارا دینے کی کوشش کی۔ اس کا لباس خون سے تر تھا۔ جین سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ موسیو ہنٹن اپنی کرسی سے اُٹھا۔ چند ثانیے اپنا دل دونوں ہاتھوں سے دبائے کھڑا رہا۔ اور پھر اچانک منہ کے بل گر پڑا۔ میں ڈینس کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا اور اُسے اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے دل کی حرکت بند ہو چکی تھی۔ میں دوبارہ ڈینس کی طرف متوجہ ہوا اور اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن اُس نے کہا۔ "موسیو تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ پولیس میرا پیچھا کر رہی ہے۔ تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔"

دونوکر انتہائی بدحواسی کی حالت میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہا۔ جین پہلے اپنے باپ کی لاش کے ساتھ لپٹ کر چیخیں مارتی رہی اور پھر اپنے بھائی کا سر گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ میرے لیے یہ ایک بھیانک خواب تھا۔ اور یہ خواب میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ سوتے جاگتے یہ دل خراش منظر میری

آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

ڈینس بار بار مجھے یہ کہہ رہا تھا، تم بھاگ جاؤ، تمہارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں تم بے گناہ پکڑے جاؤ گے۔ اچانک پولیس کا ایک انسپکٹر اور چند سپاہی کمرے میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر نے ڈینس کے سر کے بال پکڑ کر اُسے انتہائی بے دردی سے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "بتاؤ تمہارے ساتھی کون تھے؟"

جین نے انسپکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن ایک سپاہی نے اُسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔ میں نے ایک مکا سپاہی کے منہ پر رسید کیا اور اس کے بعد انسپکٹر کا گلا دبوچ لیا۔ باقی سپاہی مجھ پر ٹوٹ پڑے اور میں اُن کی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ انسپکٹر پھر ایک بار ڈینس کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر یہ پوچھ رہا تھا۔ "بتاؤ تمہارے ساتھی کون ہیں؟" لیکن ڈینس کے پاس ایک حقارت آمیز مسکراہٹ کے سوا اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اور یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اس وقت بھی کھیل رہی تھی جب کہ وہ اپنا سفرِ حیات ختم کر چکا تھا۔

انسپکٹر نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "یہ مر چکا ہے لیکن تم زندہ ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم ہمارے ہر سوال کا جواب دے سکو گے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ اس نے کیا جرم کیا ہے۔ لیکن تمہیں ایک زخمی کے ساتھ اس وحشیانہ سلوک کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

جین کی چیخیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ سپاہیوں کو میری طرف متوجہ پا کر بھاگتی ہوئی عقب کے کمرے میں چلی گئی۔

انسپکٹر کے حکم سے میرا کوٹ اُتار دیا گیا اور مجھے دروازے کے سامنے برآمدے کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ پھر ایک سپاہی مجھ پر کوڑے برسا

رہا تھا اور انسپکٹر بار بار ڈینس کے دوسرے ساتھیوں کے متعلق مجھ سے سوال کر رہا تھا۔ میں نے اسے ہر ممکن طرح سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھے ڈینس کے کسی ساتھی کا علم نہیں اور میں فوجی اسکول میں تعلیم حاصل کرتا ہوں اور اس وقت میرا اس مکان میں موجود ہونا محض ایک اتفاق تھا۔ لیکن انسپکٹر میری کسی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اچانک جین اپنے ہاتھ میں پستول لیے نمودار ہوئی اور اس نے کسی توقف کے بغیر انسپکٹر پر گولی چلا دی۔ گولی انسپکٹر کے بازو پر لگی اور سپاہیوں نے جین کو گرفتار کرلیا۔ اب سپاہیوں کی توجہ میری بجائے انسپکٹر پر مرکوز ہو چکی تھی۔ اس کے بازو سے خون بہ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا کوٹ اتارا اور ایک سپاہی کو بازو پر پٹی باندھنے کے لیے کہا۔ اچانک دس بارہ آدمی مکان کے پائیں باغ سے نمودار ہوئے اور وہ پولیس پر ٹوٹ پڑے۔ آن کی آن میں انہوں نے دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور باقی چار آدمیوں کو غیر مسلح کر کے حراست میں لے لیا۔ حملہ آوروں کے چہروں پر نقاب تھے اور میرے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ کون ہیں۔ مجھے آزاد کرنے کے بعد انہوں نے ڈینس کے متعلق پوچھا اور میں نے انہیں بتایا کہ ڈینس اور اس کے والد کی لاشیں اندر پڑی ہوئی ہیں۔ انھوں نے انسپکٹر اور اس کے باقی ساتھیوں کو رسیوں میں جکڑ کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ پھر ایک آدمی نے جین سے کہا۔ ”ڈینس کی بہن، ہم سب کی بہن ہے۔ آج ایک غدار نے پولیس کو ہمارے خُفیہ اجلاس کے متعلق خبر دار کر دیا تھا۔ اب آپ کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لئے آپ ہمارے ساتھ چلیں۔“

جین نے جواب دیا۔ ”نہیں میں اپنے باپ اور بھائی کے لاشیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ پولیس میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔“

نواب پوش نے کہا۔" میری بہن! ڈینس نے ایک بڑے مقصد کے لیے جان دی ہے اگر آپ نے یہاں ٹھہرنے پر ضد کی تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ ہم اپنے ایک ساتھی کی بہن کی عزت بچانے کی لیے اپنے آپ کی پولیس کے حوالہ کردیں۔ ہمیں اپنی جان کا خوف نہیں لیکن ہم اس مقصد کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں جو ڈینس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ خدا کے لیے آپ وقت نہیں، چلیے آپ شاید ایک عرصہ کے لیے دوبارہ اس گھر میں نہ آسکیں اس لیے گھر میں جو نقدی یا زیور ہے وہ نکال لیجیے۔"

جین اضطراب اور تذبذب کی حالت میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ نقاب پوش نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔ 'موسیو معلوم ہوتا کہ غلط اتفاق نے ہماری صف میں کھڑا کردیا ہے۔ چلیے اب آپ لوگوں کے مقاصد کے ساتھ کوئی دلچسپی ہوسکتی ہے۔ اگر آپ کسی خطرناک جماعت سے تعلق رکھتے ہیں تو ہمارے راستے مختلف ہیں۔ ہمارا اگر کوئی جُرم ہے تو وہ صرف یہ کہ میں نے ایک زخمی کے ساتھ پولیس کے وحشیانہ سلوک سے متاثر ہوکر انسپکٹر پر ہاتھ اُٹھایا ہے اور میں پیرس کی ہر عدالت کی سامنے اس جُرم کا اقبال کرنے کے لیے تیار ہُوں۔"

نقاب پوش نے کہا۔" ہم تمھیں اپنے ساتھ شریک ہونے کی دعوت نہیں دیتے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اب تم پیرس کی پولیس کو کبھی اس بات کا یقین نہیں دلاسکو گے کہ تم فرانس کے ایک امن پسند شہری ہو۔ ہم صرف تمھاری جان بچانا چاہتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ جین کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کے لیے ہمیں تمھاری اعانت کی ضرورت ہے۔"

میں نے جلدی سے اپنا کوٹ پہنا اور جین سے کہا۔" جین! میں تمھارے

ساتھ ہُوں۔ ہمارے لیے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اب وقت ضائع نہ کرو!''

جین کی قوت فیصلہ جواب دے چکی تھی۔ تاہم میرے اور اپنے بھائی کے دوستوں کے سمجھانے پر وہ گھر چھوڑنے پر آمادہ ہوگئی۔ ہم نے گھر سے نقد روپیہ اور زیورات کے علاوہ جین کے چند ضروری کپڑے نکال کر ایک بکس میں رکھ لیے۔ اتنی دیر میں دو آدمی بگھی تیار کر چکے تھے۔ ایک نوجوان نے کوچوان کی جگہ سنبھال لی اور ہم وہاں سے روانہ ہوگئے پیرس کے بازاروں اور گلیوں میں ابھی تک رونق تھی اور ہمیں پہرے داروں نے روکا لیکن میری وردی دیکھ کر انھوں نے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ صبح تک ہم پیرس سے کئی میل دُور آ چکے تھے۔

ایک شہر کے قریب پہنچ کر ہمارے کوچوان نے بگھی روکی اور مجھے کہا۔ ''اب گھوڑے بہت تھک گئے ہیں اور یُوں بھی اس بگھی پر تمھارا سفر خطرناک ہوگا۔ میرے ساتھی صبح ہوتے ہی مکان چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے۔ اس وقت تک شاید پولیس اپنے آدمیوں کا حال معلوم کر چکی ہو۔ انھیں موسیو ڈینس کے نوکروں سے تمھارا پتہ معلوم کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ پھر وہ فوجی اسکول سے باسانی تمھارے گھر کا پتہ معلوم کرلیں گے اور دوپہر سے پہلے پہلے اس سڑک پر تمھاری تلاش شروع ہو جائے گی۔ میں تمھیں اس شہر کی سرائے میں پہنچا کر واپس آ جاؤں گا اور پولیس کو دھوکا دینے کے لیے اس بگھی کو کسی دوسری سڑک پر چھوڑ دوں گا۔''

یہ نوجوان جو ایک کوچوان کی حیثیت سے ہمارے ساتھ آیا تھا۔ انقلابی جماعت کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ اس سے چند سوالات پوچھنے پر مجھے یہ معلوم ہُوا کہ ڈینس ان سرپھروں کا لیڈر تھا اور گزشتہ شب جب ایک مکان میں ان لوگوں کا جلسہ ہو رہا تھا۔ کسی غدار نے پولیس کو خبردار کر دیا تھا۔ بیشتر انقلابی مسلّح ہو کر

آئے تھے۔ پولیس آس پاس کی گلیوں کی نا کہ بندی کے لیے جمع ہو رہی تھی کہ انقلابیوں کو پتہ چل گیا اور وہ بھاگ نکلے۔ ایک گلی میں پولیس کے چند آدمیوں کے ساتھ ان کا تصادم ہوا اور دو نوجوان ہلاک ہو گئے۔ ڈینس اس تصادم میں زخمی ہو کر بھاگا لیکن تھوڑی دُور جا کر گر پڑا۔ اس کے دو ساتھیوں نے اُسے سہارا دیا اور اسے گھر کے دروازے تک پہنچا گئے۔ جب وہ واپس آ رہے تھے تو انھیں پولیس کے سپاہیوں کی ایک ٹولی دکھائی دی۔ وہ پاس ہی ایک تنگ گلی کے اندر ایک اور انقلابی کے مکان میں چھُپ گئے اور جب پولیس آگے نکل تو ان میں سے ایک نوجوان صورت حالات کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکلا تھوڑی بعد اس نے آ کر یہ بتایا کہ پولیس کے سپاہی ڈینس کے مکان میں داخل ہو چکے ہیں ان لوگوں نے چند منٹ کے اندر اندر اپنے دوسرے ساتھیوں کو جمع کیا اور ہماری مدد کو پہنچ گئے۔

جین بے حس و حرکت بیٹھی ہماری باتیں سُن رہی تھی بگھی دوبارہ روانہ ہوئی اور تھوڑی دیر ہم شہر کی سرائے میں پہنچ گئے وہاں سے ہم نے ہم نے دوسری بگھی کرائے پر لی اور اپنے دوسرے ساتھی کو خُدا حافظ کہا باقی راستہ ہم نے بہت کم آرام کیا۔

جین اپنے ساتھ کافی روپیہ لائی تھی اور ہمیں ہر منزل پر تازہ دم گھوڑے حاصل کرنے میں کوئی دِقت پیش نہ آئی تیسری رات دو بجے کے قریب میں اپنے گھر پہنچ گیا بگھی کو میں نے احتیاط مکان سے دور سڑک پر ہی چھوڑ دیا تھا ہمارا نوکر سو رہا تھا اور میں نے اُسے جگانا مناسب نہ سمجھا میرے باپ نے انتہائی رنج اور اضطراب کی حالت میں ہماری سرگزشت سُنی انھیں یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ ہمیں فوراً فرانس کی حدود سے باہر نکل جانا چاہیے انھوں نے جلدی سے ضروری سامان باندھا اور کہا ہم مارسیلز جا رہے ہیں میں ابھی سرائے سے بگھی لے کر آتا ہوں تم اپنے سکول کی

وردی اتار کر دوسرا لباس پہن لو اور سڑک پر پہنچ کر میرا انتظار کرو!"

تھوڑی دیر بعد ہم مارسیلز کا رخ کر رہے تھے مارسیلز پہنچ کر ہم امریکہ جانا چاہتے تھے لیکن بدقسمتی سے امریکہ جانے والا ایک جہاز ہمارے پہنچنے سے ایک دن قبل روانہ ہو چکا تھا۔ اور دوسرا جہاز دو روز قبل چھوٹنے والا تھا۔ ہمارے لیے ایک ایک لمحہ تشویشناک تھا اتفاق سے میرے والد کو کپتان فرانسک مل گئے یہ کسی زمانے میں میرے والد کے ماتحت رہ چکے تھے۔

ان کا جہاز اگلی صبح چند سپاہی اور اسلحہ لے کر ماریشس کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ کپتان فرانسک نے رات کے وقت ہمیں اپنے پاس ٹھہرایا اور پچھلے پہر باقی سواریوں سے کچھ دیر پہلے ہمیں اپنے جہاز پر پہنچا دیا۔ بندرگاہ کا محافظ افسر بھی میرے والد کا دیرینہ دوست نکلا اور اس کی مدد سے ہم جانچ پڑتال سے بچ گئے۔ مارسیلز پہنچنے سے قبل میرے والد کا یہ خیال تھا کہ وہ ہمیں امریکہ جانے والے کسی جہاز پر سوار کرا کے واپس چلے جائیں گے۔ لیکن جب کپتان فرانسک نے انہیں یہ سمجھایا کہ اب فرانس میں آپ کا رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں تو وہ ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کی آمادگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ جہاز ماریشس جا رہا تھا۔ اور وہاں میری بہن رہتی تھی۔ کپتان فرانسک نے ہمیں جہاز کے ملاحوں کی وردیاں مہیا کر دیں۔ اور جین کے متعلق انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ اس کا شوہر ماریشس کی فوج میں ملازم ہے اور یہ اس کے پاس جا رہی ہے۔

بحری سفر کے دوران مجھے اگر کوئی پریشانی تھی تو وہ جین اور اپنے باپ کے متعلق تھی۔ جین ہر وقت حزن و غم کی تصویر بنی رہتی تھی۔ زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے اُس کے چہرے کی دل فریب مسکراہٹیں چھین لی تھیں۔ جب میں کوئی بات کرتا

وہ کھوئی کھوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی اور مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتی۔ اپنے باپ کے متعلق میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں اُنہیں آرام کی ضرورت تھی اور میری وجہ سے وہ مصیبت میں پھنس گئے ہیں لیکن ابا جان کو اپنے مقدر کے متعلق کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ ہر حالت میں مسکرانے کے عادی تھے۔ جہاز پر انہوں نے کپتان کے حصے کا بہت سا کام سنبھال رکھا تھا۔

پھر ہماری بدنصیبی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ مریشس سے چند دن کے فاصلے پر ہمارے جہاز میں زرد بخار کی وبا پھوٹ نکلی۔ اور تین دن کے اندر اندر آٹھ آدمی مر گئے۔ پانچویں دن میرا باپ بھی چل بسا۔ ہم سب زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن جین پر اس کا جو اثر ہوا۔ وہ ہم سب کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ دن رات تمام بیماروں کی تیمارداری میں مصروف رہتی تھی۔ دوسرے لوگ یہاں تک کہ جہاز کا ڈاکٹر بھی مریضوں کے پاس بیٹھنے سے گھبراتا تھا۔ لیکن جین ہر مریض کی تیمارداری اپنا فرض سمجھتی تھی۔ اُسے اپنی بھوک پیاس اور تھکاوٹ تک کا احساس نہ تھا۔

بیماری پھیلتی گئی اور کپتان نے جزیرہ بوربون کے ساحل پر رکنے کا فیصلہ کیا لیکن ابھی ہم وہاں سے دو دن کے راستے پر تھے کہ ہمیں ایک شدید طوفان کا سامنا کرنا پڑا ہم رات بھر زندگی اور موت کی درمیان لٹکتے رہے۔ اگلے دن طوفان تھم گیا۔ اور ہمیں بوربون کا ساحل نظر آنے لگا۔ زرد بخار کی وبا کے باعث تیس آدمی ہلاک ہو چکے تھے۔ بوربون کی کی بندرگاہ پر اُترنے کے بعد جہاز کے کسی آدمی کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ ہمارے لیے سمندر کے کنارے کیمپ لگا دیا گیا۔ کپتان فرانسسک نے یہاں بھی ہماری مدد کی اور ہمیں رات کے وقت کیمپ سے نکال کر مریشس جانے والے ایک عرب تاجر کے جہاز پر سوار کرا دیا۔ رخصت

کے وقت انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ مجھے اپنے جہاز کی مرمت کے لیے کچھ عرصہ یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ تمہارے لیے کسی بندرگاہ پر اترنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس لیے عرب تاجر تمہیں بندرگاہ سے کچھ دور ساحل پر اُتار دے گا۔ میں جہاز کی مرمت کے بعد جلد از جلد ماریشس پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ پھر وہاں سے تمہیں ہندوستان پہنچانے کا بندوبست کردوں گا۔ تمہیں ماریشس میں کسی پر اپنا صحیح نام ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ پیرس کی پولیس تمہارے متعلق معلومات حاصل کرتے ہی ماریشس میں تم کو تلاش کرے گی۔

پھر کپتان فرانسسک نے مجھے ایک خط دیتے ہوئے کہا۔ ''ماریشس کی پولیس کا ایک افسر میرا دوست ہے اور میں نے یہ خط اُس کے نام لکھا ہے اگر تمہیں کبھی ضرورت پڑے تو یہ خط اس کے پاس لے جانا وہ تمہاری ہر ممکن اعانت کرے گا۔''

عرب تاجر ان لوگوں میں سے تھا جو ہر مصیبت زدہ انسان کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ ہماری زبان نہیں سمجھتا تھا لیکن ہماری صورتیں دیکھ کر اس کے لیے یہ معلوم کرنا مشکل نہ تھا کہ ہم مصیبت زدہ ہیں۔ ایک شام اس نے ہمیں ماریشس کی بندرگاہ سے چند میل دور اُتار دیا اور جہاز کا ایک ملاح ہمارے ساتھ روانہ کردیا۔ آدھی رات تک ہم ایک خوفناک جنگل میں چلتے رہے۔ بالآخر ملاح نے ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے رکتے ہوئے کہا۔ '' اب شہر یہاں سے بالکل قریب ہے لیکن اس وقت آپ کا شہر میں داخل ہونا ٹھیک نہیں ہوگا۔ پہریدار یقیناً آپ سے کئی سوال پوچھیں گے۔''

جین تھکاوٹ سے نڈھال تھی وہ ندی کے کنارے لیٹتے ہی سوگئی اور میں باقی رات ملاح کے ساتھ اس کے قریب بیٹھا رہا۔ علی الصباح میں نے جین کو جگایا اور ہم

شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد میں اپنے بہنوئی کے مکان پر دستک دے رہا تھا۔ ملاح ہمیں چھوڑ کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا بہنوئی اب میجر بن چکا تھا۔ اور مریشس کی حکومت اور فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے دوست تھے۔ تاہم میری سرگزشت سننے کے بعد اس نے کہا۔ ''اگر پیرس کی پولیس کا کوئی آدنیٰ افسر بھی یہاں پہنچ گیا تو مریشس کا گورنر بھی تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم گھر سے باہر پاؤں نہ رکھو۔ اگر پیرس سے پولیس کا کوئی آدمی یہاں پہنچ گیا تو میں تمہیں کسی دوست کے ہاں پہنچا دوں گا۔ مقامی پولیس کے تمام افسر میرے دوست ہیں اور وہ وقت آنے پر مجھے خبردار کر دیں گے۔''

ہم بیس دن اپنے بہنوئی کے گھر چھپے رہے۔ پھر ایک شام ہمیں پتہ چلا کہ مارسیلز سے ایک جہاز آیا ہے۔ اور فرانس کی پولیس کا ایک انسپکٹر اس سے اترتے ہی سیدھا مقامی پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں گیا ہے۔ میرے بہنوئی نے یہ خبر سنتے ہی ہمیں اپنی رجمنٹ کے ایک کپتان کے گھر پہنچا دیا۔ اگلے دن کپتان کی بیوی میری بہن کے پاس گئی اور یہ خبر لائی کہ ہمارے وہاں سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ایک پولیس انسپکٹر اُن کے گھر آیا تھا۔ اور میرے بہنوئی سے چند سوالات پوچھنے کے بعد وہ گھر کی تلاشی لیے بغیر واپس چلا گیا تھا۔ پھر رات کے وقت میرا بہنوئی مجھ سے ملا اور اس نے یہ بتایا۔ ''یہ وہی انسپکٹر ہے جس پر جین نے گولی چلائی تھی۔ اس کا نام برنارڈ ہے۔ اور اس کی ہوشیاری اور شقاوت قلبی فرانس بھر میں مشہور ہے۔ میں نے بظاہر اسے مطمئن کر دیا ہے۔ لیکن جب تک وہ یہاں موجود ہے مجھے تمہارے متعلق اطمینان نہیں ہو سکتا۔ یہاں کوئی ایسا آدمی نہیں جس پیرس کی پولیس کے کسی افسر کے ساتھ ہمدردی ہو لیکن اگر اسے تمہارا سراغ مل گیا تو تم یہ دیکھو گے کہ یہاں کوئی کھلے

بندوں تمہاری حمایت نہیں کرے گا۔اب چند دن تک ہمارا ایک دوسرے سے دور رہنا ضروری ہے۔اس لیے اگر میں تمہارے پاس نہ آسکوں تو تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

اگلی صبح جین اپنے بستر سے اٹھی تو اس نے یہ شکایت کی کہ میرا جسم ٹوٹ رہا ہے اور شام تک اسے سخت بخار ہو چکا تھا۔جہاز پر زرد بخار کی وبا کے پیش نظر مجھے بے حد تشویش ہوئی لیکن رات کے وقت کپتان اپنے فوجی ڈاکٹر کو لایا اور اس نے تسلی دی کہ یہ صرف موسمی بخار ہے۔جین دس دن بستر پر پڑی رہی۔ گیارھویں دن اسے ذرا ہوش آیا۔اس عرصہ میں کپتان کی بیوی کی وساطت سے ہمیں یہ پتہ چلتا رہا کہ انسپکٹر برنارڈ ہماری تلاش میں بدستور سرگرداں ہے۔ بارھویں دن جین کا بخار بہت کم ہو گیا لیکن وہ بے حد کمزور ہو چکی تھی۔صبح سات بجے کسی نے ہمارے میزبان کے دروازے پر دستک دی۔ ہم فوراً ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں چھپ گئے۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے اور میں دبی آواز میں یہ کہہ رہا تھے۔'' جین ہم تقدیر سے نہیں بھاگ سکتے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے متعلق تمہارے خیالات کیا ہیں۔ لیکن میں تمہیں اپنی زندگی کا آخری سہارا سمجھتا ہوں۔اگر میں تمہارے ساتھ کسی چھوٹے سے غیر آباد جزیرے میں اپنی باقی زندگی تمام زندگی کے دن گزار سکتا تو مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی فرانس چھوڑنے کا ملال نہ ہوتا۔''

جین نے مغموم نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور اپنا کانپتا ہوا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔میرا خیال تھا کہ ابھی پولیس دھکا دے کر ہماری کوٹھڑی کا دروازہ کھولے گی اور ہمیں انسپکٹر برنارڈ کی منحوس صورت دکھائی دے گی۔لیکن اچانک ہمیں ملاقات کے کمرے میں چند مانوس آوازیں اور قہقہے سنائی دیے۔پھر ہمارے

میزبان نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔ ''میرے دوست آجاؤ اب کوئی خطرہ نہیں۔''

میں جین کو سہارا دیئے کوٹھڑی سے باہر نکلا۔ ملاقات کے کمرے میں میری بہن، میرا بہنوئی اور کپتان فرانسسک کھڑے تھے۔ نقاہت کے باعث جین کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ میں نے اُسے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ میری بہن آگے بڑھ کر میرے ساتھ لپٹ گئی۔ کپتان فرانسسک نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔'' بھئی خدا کی قسم میں نے اس سے بڑا گدھا اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس کی ذہانت فرانس بھر میں مشہور ہے لیکن وہ خوب اُلو بنا۔''

میں پریشانی کی حالت میں فرانسک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری بہن نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔'' کپتان صاحب! میرا بھائی ابھی تک پریشان ہے اسے تسلّی دیجیے۔'' اور کپتان فرانسک نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا بیٹا اب تمھیں کوئی خطرہ نہیں میں نے انسپکٹر برنارڈ کو ایک غلط راستے پر ڈال دیا میرا جہاز کل شام یہاں پہنچا تو وہ بندرگاہ پر کھڑا تھا اُترنے والے مُسافروں کو دیکھنے کے بعد اس نے جہاز کے اندر بھی تلاشی لی میں نے اُس سے کہا کہ اگر آپ مجھے یہ بتا سکیں کہ آپ کس کو تلاش کر رہے ہیں تو ممکن ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں اُس نے مجھ سے تمھارے متعلق پوچھا اور میں نے اُسے بتایا کہ مارسیلز سے میرے جہاز پر ایک بوڑھا آدمی، ایک نوجون اور ایک لڑکی سوار ہوئے تھے،''

مَیں نے بدحواس ہو کر کہا۔'' آپ نے اسے ہمارے متعلق بتا دیا ہے؟''

''ہاں! مَیں نے اُسے تمھارا حلیہ تک بتا دیا تھا کیونکہ اسے بیوقوف بنانے کا بہترین طریقہ یہی تھا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ اسے کسی نہ کسی دن اس بات کا

پتہ ضرور چل جائے گا کہ میرے جہاز پر ایک لڑکی سوار تھی اور یہی بات بعض اوقات بہت سُود مند ثابت ہوئی ہے میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ بیماری کے باعث جہاز کے تمام مسافر بوربون اُتار دیے گئے تھے۔ چند آدمی میرے ساتھ آ گئے ہیں لیکن باقی ابھی تک وہیں پڑے ہُوئے ہیں، میں نے اُسے تمھارے والد کی وفات کے متعلق بھی بتا دیا تھا اور میں نے اسے تمھارے نام بھی صحیح بتا دیے تھے۔ میری ان باتوں کا یہ نتیجہ ہُوا کہ دیکھتے دیکھتے وہ بوربون جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا اب میں کل شام تک یہاں سے پانڈی چری روانہ ہو جاؤں گا اور تم میرے ساتھ چلو گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرے راستے سے اب مصائب کے پہاڑ ہٹ چکے ہیں لیکن جین کی حالت سفر کے قابل نہ تھی ہم نے رات کے وقت ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو اس نے بڑی شدت کے ساتھ جین کو سفر کرنے سے منع کیا، میرا بہنوئی یوں بھی ہمارے ایک ساتھ سفر کرنے کے حق میں نہ تھا اس نے یہ مشورہ دیا کہ تم ہندوستان جا کر اپنے لیے کوئی جائے پناہ تلاش کرو ہم جین کو بعد میں وہاں پہنچانے کا انتظام کر دیں یہاں کوئی فرانسیسی ایسا نہیں جو جین جیسی لڑکی کو پیرس کی پولیس کے تشدد کے خلاف پناہ دینے سے انکار کرے گا۔"

اگلی شام غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے کپتان فرانسک کا جہاز روانہ ہو چکا تھا اور میں عرشے پر کھڑا ماریشس کی آخری جھلک دیکھ رہا تھا پانڈی چری پہنچنے کے بعد میری داستان کا ایک باب ختم ہوتا ہے۔ اس سے آگے مجھے ایک وسیع خلا دکھائی دیتا ہے۔"

لیگر انڈ کی سرگزشت سننے کے بعد انور علی کچھ دیر اپنے بستر پر بے حس

وحرکت پڑا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ ''میرے دوست مَیں تمھاری مدد کروں گا۔''

تیسرا باب

لیگر انڈ کو انور علی کے ساتھ رہتے ہوئے ڈیڑھ مہینہ گزر گیا۔ اس عرصہ میں اسے جین کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی۔ پانڈی چری میں جب کوئی نیا جہاز آتا تو اس کے سینے میں اُمیدوں اور آرزوؤں کے چراغ جگمگا اٹھتے، بندرگاہ پر جاتے ہوئے جین کے تصور سے اس کی دنیا مسکراہٹوں اور نغموں سے لبریز ہو جاتی۔ پھر جب اُسے جہاز سے اُترنے والے مسافروں میں جین نظر نہ آتی تو وہ اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دینے کی کوشش کرتا، شاید جین ابھی تک جہاز کے اندر چھپی ہوئی ہو اور کپتان نے اس کا دوسرے لوگوں کی موجودگی میں بندرگاہ پر اُترنا مناسب خیال نہ کیا ہو، جب بندرگاہ خالی ہو جاتی تو وہ ذرا جرات سے کام لے کر جہاز کے کپتان کے پاس جاتا اور یہ تسلی کرنے کے بعد کہ جہاز پر کوئی اور مسافر نہیں، وہ اس سے اس قسم کے سوالات پوچھتا۔ ''آپ کے جہاز پر کوئی ایسا مسافر تو نہیں تھا جسے آپ بیماری کی وجہ سے راستے میں چھوڑ آئے ہوں۔ میں میسور کی فوج میں ملازم ہوں اور مجھے اپنے ایک دوست کا انتظار ہے۔ گزشتہ چند ہفتوں میں مریشس سے آنے والے کسی جہاز کو کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا؟''

ایک دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا میں حبس تھا اور انور علی اپنے خیمے سے باہر ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک لیگر انڈ بھاگتا ہوا اُس کے قریب پہنچا۔ انور علی کو اُس کی پریشان صورت یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ کوئی متوقع حادثہ پیش آنے والا ہے۔

''خیر تو ہے؟'' اُس نے لیگر انڈ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

لیگر انڈ نے مغموم لہجے میں جواب دیا! انسپکٹر برنارڈ پانڈی چری پہنچ

گیا ہے۔میں نے اسے جہاز سے اُترتے دیکھا ہے۔میں یہ معلوم نہیں کرسکا کہ یہ جہاز کہاں سے آیا ہے لیکن اگر یہ جہاز مریشس سے ہو کر آیا ہے تو ہو سکتا ہے جین بھی اس پر سوار ہو۔میں نے انسپکٹر کو دیکھنے کے بعد بندرگاہ پر ٹھہرنا مناسب خیال نہیں کیا۔"

انور علی نے پوچھا۔"اس نے آپ کو دیکھ تو نہیں لیا؟"

"نہیں۔جہاز سے اُترتے ہی پانڈی چری کے چند افسر اس کے گرد جمع ہو گئے تھے اور میں وہاں سے کھسک آیا تھا۔"

انور علی نے کرسی سے اُٹھ کر اپنے سپاہیوں میں سے ایک نوجوان کو آواز دے کر بلایا اور اسے چند ہدایات دینے کے بعد لیگرانڈ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔"آپ فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں۔میں نے اپنے آدمی کو سمجھا دیا ہے۔کہ وہ اآپ کے ساتھ یہاں سے چند میل دور ایک جگہ پر پہنچ کر میرا انتظار کرے۔میں شام تک بندرگاہ سے تمام معلومات حاصل کر کے آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔اگر جین اس جہاز پر آئی ہے تو میں اسے اپنے ساتھ لانے کی کوشش کروں گا۔بصورتِ دیگر آپ کو ضروری ہدایات مل جائیں گی۔اگر جین اس جہاز پر نہ آئی تو بھی آپ انسپکٹر برنارڈ کی موجودگی میں یہاں ٹھہر کر اس کا انتظار نہیں کر سکتے۔آپ کے لیے یہی بہتر ہو گا کہ آپ پانڈی چری کی حدود سے نکل جائیں۔اس کے بعد اگر جین یہاں پہنچ گئی تو اُسے آپ کے پاس پہنچانا میرا ذمہ ہے۔"

لیگرانڈ نے کہا۔"مجھے ڈر ہے کہ جین شاید آپ پر اعتماد نہ کرے۔ لیکن جب آپ اسے جین کی بجائے مادام لیگرانڈ کہہ کر مخاطب کریں گے تو وہ بہت کچھ سمجھ جائے گی۔جہاز پر وہ اسی نام سے سفر کر رہی ہو گی۔"

"آپ تسلی رکھیں۔ جین خواہ کسی نام سے سفر کر رہی ہو مجھے تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ یہ کہہ کر انور علی دلاور خاں کی طرف متوجہ ہوا اور اسے دو گھوڑے تیار رکھنے کا حکم دے کر بندرگاہ کی طرف چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد لیگرانڈ اور انور علی کا ایک ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر مغرب کا رخ کر رہے تھے۔ پانڈی چری سے کوئی پندرہ میل دور ایک چھوٹی سی ندی کے پل کے قریب پہنچ کر لیگرانڈ کے رہنما نے اپنا گھوڑا روکا اور کہا۔" جناب اُنہوں نے ہمیں یہاں رکنے کا حکم دیا تھا۔"

لیگرانڈ نے اپنا گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔" تمہیں یقین ہے کہ انہوں نے ہمیں اسی جگہ پہنچنے کے لیے کہا تھا؟"

"جی ہاں: کرشنا گری کی طرف یہی راستہ جاتا ہے اور میں کم از کم آٹھ مرتبہ یہاں سے گزر چکا ہوں۔" یہ کہہ کر نوجوان گھوڑے سے اُتر پڑا اور لیگرانڈ نے اس کی تقلید کی۔ انہوں نے اپنے گھوڑے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیے۔ اور ندی کے کنارے بیٹھ گئے۔ لیگرانڈ کے لیے انتظار کے لمحات انتہائی صبر آزما تھے۔ وہ کبھی اُٹھ کر ادھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیتا۔ کبھی اپنا خنجر نکال کر درخت کی شاخیں تراشنے لگتا۔ کبھی نڈھال سا ہو کر ندی کے کنارے بیٹھ جاتا اور سنگریزے اُٹھا اُٹھا کر پانی میں پھینکنا شروع کر دیتا۔ جب آس پاس کوئی آہٹ یا آواز سنائی دیتی تو وہ بھاگ کر پُل پر پہنچتا لیکن سوار اور پیدل گزر جاتے اور وہ کلیجہ مسوس کر رہ جاتا۔

☆☆

شام کے چار بجے کے قریب بارش شروع ہو گئی اور وہ ایک تناور درخت کے نیچے سمٹ کر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اور

لیگرانڈ کے ساتھی نے کہا۔" لیجیے وہ آ گئے!"۔

لیگرانڈ بھاگ کر پگڈنڈی کی طرف بڑھا۔اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا لیکن انور علی کو تنہا دیکھ کر لیگرانڈ کے پاؤں زمین سے پیوست ہو کر رہ گئے۔انور علی نے اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی باگ کھینچی اور نیچے اُترتے ہوئے کہا۔" مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے لیے کوئی خوش خبری نہیں لایا۔جین اس جہاز پر نہیں آئی۔ یہ جہاز بوربون سے یہاں پہنچا ہے۔ میں کپتان سے مل کر آیا ہوں۔انسپکٹر برنارڈ کے متعلق ابھی تک صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ اس کا بھتیجا پانڈی چری کی فوج میں ملازم ہے اور وہ اس کے پاس ٹھہرا ہے۔لیکن یہ ظاہر ہے کہ صرف ایک بھتیجے سے ملنے کا شوق اُسے یہاں تک آنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ہمیں اب یہ دعا کرنی چاہیے کہ جین اس کی موجودگی میں یہاں نہ پہنچے۔میں کوشش کروں گا کہ مریشس میں آپ کے بہنوئی کو اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کر دوں۔لیکن اگر جین وہاں سے روانہ ہو چکی ہے تو آپ پانڈی چری میں رہ کر اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

اس کے بعد انور علی نے اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھا ہوا سفری تھیلا اُتارا اور لیگرانڈ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔" اس تھیلے میں آپ کے لیے رات کا کھانا، کچھ روپے اور تین تعارفی خط ہیں۔ایک خط میں نے کرشنا گری کے فوجدار کے نام لکھا ہے وہ آپ کو سرنگا پٹم پہنچانے کا بندوبست کر دے گا۔دوسرا خط موسیو لالی کے نام ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی ہر ممکن اعانت کرے گا۔تیسرا خط میں نے اپنے بھائی کے نام لکھا ہے، سرنگا پٹم میں آپ اسے بہترین دوست پائیں گے۔اگر ضرورت پڑی تو میرا بھائی آپ کے لیے سرنگا پٹم کے بڑے سے بڑے آدمی کی اعانت حاصل کر سکے گا۔میرا یہ آدمی آپ کو کرشنا گری پہنچا کر واپس

آجائے گا۔ آپ وہاں پہنچتے ہی میرے نام اس مضمون کا ایک خط لکھ کر اس کے حوالے کردیں کہ آپ سلطان کی فوج میں ملازم ہیں اور اگر آپ کی بیوی پانڈی چری پہنچے تو میں اسے آپ کے پاس پہنچانے کا بندوبست کردوں۔ جین اگر آپ کے ہاتھ کی تحریر پہچانتی ہے تو وہ مطمئن ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر وہ انسپکٹر برنارڈ کی موجودگی میں یہاں پہنچی تو یہ خط میرے کام آئے گا۔ اب میں فوراً واپس جانا چاہتا ہوں جین کی غیر متوقع آمد کے پیش نظر میرا ہر وقت وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ آج رات ہی ماریشس کا کوئی جہاز وہاں پہنچ جائے۔ میں بندرگاہ پر اس بات کا انتظام کر آیا ہوں کہ جب کوئی نیا جہاز آئے مجھے خبردار کر دیا جائے۔"

انور علی نے کسی توقف کے بغیر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا اور لیگرانڈ نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "موسیو! آپ بہت رحم دل ہیں۔"

☆☆

تین ہفتے بعد انور علی طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ بعد ایک جہاز کی آمد کی اطلاع پا کر بندرگاہ پر پہنچا تو وہاں انسپکٹر برنارڈ اور پانڈی چری کی پولیس کے دو افسر موجود تھے۔ انور علی کے لیے یہ غیر متوقع نہ تھی۔ انسپکٹر برنارڈ اس سے پہلے بھی ہر نئے جہاز کی آمد کے وقت بندرگاہ پر موجود ہوتا تھا۔ پانڈی چری پہنچنے سے دو دن بعد اس نے انور علی کے کیمپ سے فرانس کے ان آدمیوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو میسور کی فوج میں بھرتی ہو کر جا چکے تھے۔ اور انور علی نے اُسے صرف وہ کاغذات دکھا کر مطمئن کر دیا تھا۔ جن میں لیگرانڈ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ برنارڈ انور علی کو یہ بھی بتا چکا تھا کہ میں ایک نہایت خطرناک انقلابی کی تلاش میں ہوں جو پیرس سے ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ فرار ہو چکا ہے۔

جہاز بندرگاہ سے ابھی کچھ فاصلے پر تھا۔ انور علی کچھ دیر تذبذب اور پریشانی کی حالت میں انسپکٹر اور اس کے ساتھیوں سے چند قدم دور کھڑا رہا۔ بالآخر ایک پولیس افسر نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ انسپکٹر برنارڈ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''موسیو! میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ آج آپ کیوں نہ آئے؟''

انور علی مسکرایا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں وقت پر پہنچ گیا ہوں۔''

مقامی پولیس کے ایک افسر نے کہا۔ ''موسیو! انور علی بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہر جہاز دیکھتے ہیں۔''

انور علی نے جواب دیا۔ ''اب یہاں آپ کے جہاز دیکھنے کے سوا مجھے اور کام ہی کیا ہے؟ خدا کا شکر ہے کہ مجھے واپس بلالیا گیا ہے۔ ورنہ میں یہاں بیکاری سے اکتا گیا تھا۔''

''آپ جا رہے ہیں؟''

''ہاں''

''کب؟''

بہت جلد، میں صرف اپنی جگہ کسی نئے آدمی کا انتظار کر رہا ہوں۔'' انور علی یہ کہہ کر انسپکٹر برنارڈ کی طرف متوجہ ہوا۔ '' کہیے آپ کو اپنی مہم میں کوئی کامیابی ہوئی؟''

برنارڈ نے جواب دیا۔ ''مجھے اپنی کامیابی کے متعلق کوئی بے چینی نہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ زندہ ہیں تو ایک نہ ایک دن ضرور گرفتار ہو جائیں گے۔''

جہاز بندرگاہ کے بہت قریب پہنچ چکا تھا اور اب عرشے پر چند عورتیں بھی

دکھائی دے رہی تھیں۔ پانڈی چری کے چند فوجی اور سول حکام بھی بندرگاہ پر موجود تھے۔ اور انتہائی اشتیاق کی حالت میں جہاز کی طرف دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد جہاز بندرگاہ پر آلگا اور مسافر نیچے اُترنے لگے۔ فرانسیسی افسر اپنے بال بچوں اور رخصت سے واپس آنے والے دوستوں کا استقبال کر رہے تھے۔ انسپکٹر برنارڈ جہاز سے اترنے والے ہر نوجوان مرد اور عورت کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ایک نیلی آنکھوں والی اور سنہری بالوں والی نحیف اور لاغر لڑکی ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بکس اُٹھائے ہوئے جہاز سے اُتری اور ہجوم سے ایک طرف کھڑی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ انور علی لیک کراس کے قریب پہنچا اور سرگوشی کے انداز میں بولا اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ لیگر انڈ کو تلاش کر رہی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا اصلی نام لیمبرٹ ہے اور آپ مادام لیگر انڈ کے نام سے سفر کر رہی ہیں۔ میری بات غور سے سنیے: انسپکٹر برنارڈ جس پر آپ نے گولی چلائی تھی یہاں موجود ہے وہ اسی طرف آ رہا ہے۔ آپ اس کی طرف نہ دیکھیں، میں لیگر انڈ کا دوست ہوں۔ وہ یہاں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن انسپکٹر برنارڈ کی آمد پر میں نے اسے سرنگا پٹم بھیج دیا ہے۔ آپ انسپکٹر پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں کہ آپ کا شوہر گزشتہ دو سال سے میسور کی فوج میں ملازم ہے۔ اپنے حواس پر قابو رکھیے۔ اگر انسپکٹر برنارڈ کو ذرا شبہ ہو گیا تو آپ مصیبت میں پھنس جائیں گی۔''

اتنی دیر میں انسپکٹر برنارڈ اُن کے قریب آ چکا تھا۔ انور علی نے اس کی طرف توجہ کیے بغیر جلدی سے لڑکی کا بکس لیا اور اپنا لہجہ بدلتے ہوئے ذرا بلند آواز سے کہا۔

''مادام پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ایک سپاہی کی بیوی کو اس قسم کی تلخیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ آپ کے شوہر ایک مہم پر روانہ ہو چکے ہیں۔ اس لیے آپ

کو سرنگا پٹم پہنچانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے ۔موجودہ حالات میں ہماری فوج کے کسی سپاہی کو چھٹی نہیں مل سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا خط پڑھ کر آپ کو تسلی ہو جائے گی۔"

انور علی نے یہ کہہ کر اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا۔لڑکی نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے خط پکڑ لیا اور کھول کر پڑھنے لگی۔

کیابات ہے موسیو؟ انسپکٹر برنارڈ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

انور علی نے جواب دیا۔" ہماری فوج کے یورپین دستے کے ایک افسر کی بیوی ہیں اور اس بات پر خفا ہیں کہ ان کے شوہر ان کے استقبال کے لیے کیوں نہیں آئے۔انہیں سرنگا پٹم پہنچانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔"

انسپکٹر برنارڈ پورے انہاک سے لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ اس کی توجہ سے بچنے کے لیے اپنی نگاہیں کاغذ پر مرکوز کیے ہوئے تھی۔

برنارڈ نے کہا۔"مادام میں یہ خط دیکھ سکتا ہوں؟"

انور علی مے مداخلت کی۔"موسیو مجھے معلوم ہے کہ آپ پیرس کی پولیس کے ایک افسر ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اپنی بیوی کے نام میسور کی فوج کے افسر کا خط پڑھنا آپ کے فرائض میں داخل نہیں۔"

برنارڈ نے جواب دیا۔" مجھے اپنے فرائض کے حدود اچھی طرح معلوم ہیں۔ اگر آپ انہیں سرنگا پٹم پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر چکے ہیں تو مجھ پر بھی ان کے متعلق بعض ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔مجھے یقین ہے کہ انہیں یہ خط دکھانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

لڑکی نے خط انسپکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ خوشی سے یہ دیکھ سکتے ہیں۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟''

برنارڈ خط پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ انور علی کا ایک سپاہی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔ ''جناب اس جہاز پر صرف آٹھ آدمی آئے ہیں۔ ان میں سے صرف تین یورپین اور باقی مریشس کے باشندے ہیں۔''

انور علی نے جواب دیا۔ ''انہیں کیمپ میں لے چلو میں ابھی آتا ہوں۔ یہ بکس اپنے ساتھ لیتے جاؤ اور مادام کے لیے ایک خیمہ لگا دو۔''

سپاہی نے چمڑے کا بکس اٹھا لیا اور انور علی نے لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''مادام آپ کا کوئی اور سامان جہاز پر تو نہیں۔''

''جی نہیں'' مجھے میرے خاوند نے لکھا تھا کہ مجھے خشکی کے راستے ایک لمبا سفر کرنا پڑے گا اس لیے مجھے اپنے ساتھ چند ضروری کپڑوں کے سوا کچھ نہیں لانا چاہیے۔''

برنارڈ نے خط پڑھنے کے بعد انور علی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''مادام کی صحت بہت خراب معلوم ہوتی ہے میرے خیال میں انہیں سرنگا پٹم کا سفر کرنے سے پہلے چند دن یہاں آرام کرنا چاہیے۔ اور آپ کو ان کے لیے خیمہ خالی کرانے کی ضرورت نہیں۔ میں گورنر کے مہمان خانے میں ان کے قیام کا انتظام کر سکتا ہوں۔''

انور علی نے جواب دیا۔ ''ذاتی طور پر مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میرے خیال میں آپ کو یہ مسئلہ میری بجائے مادام کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔

برنارڈ مسکرایا۔ ''مجھے یقین ہے کہ انہیں گورنر کا مہمان بننے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔''

اس عرصہ میں جین اپنی پریشانی پر قابو پا چکی تھی اور اس کی مدافعانہ قوتیں پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا "میری صحت بالکل ٹھیک ہے اور میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کروں گی۔ لائیے میرا خط؟

برنارڈ نے کہا۔ "یہ خط آپ کو کل تک نہیں مل سکتا؟"

"اس خط میں کوئی خاص بات ہے موسیو" انور علی نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص بات نہیں لیکن ایک پولیس افسر کو ہر بات کی جانچ پڑتال کرنی پڑتی ہے۔"

چند فرانسیسی افسران کے گرد جمع ہو چکے تھے ایک فوجی افسر نے انسپکٹر برنارڈ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "موسیو کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں" اس نے روکھے پن سے جواب دیا۔

انور علی نے جین سے کہا۔ "مادام آپ کو آرام کی ضرورت ہے اگر آپ گھوڑے پر سواری کر سکیں تو میں دو دن تک آپ کے سفر کا بندوبست کر دوں گا۔ بصورتِ دیگر مجھے بگھی کا انتظام کرنا پڑے گا۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں گھوڑے پر سفر کر سکتی ہوں"۔

برنارڈ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مادام! اگر آپ کو میری باتوں سے کوئی کوفت ہوئی ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں، میں صرف اس بات کی تسلی چاہتا تھا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اگر فرصت ملی تو میں کل آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"

"آئیے مادام!" انور علی نے کہا اور جین اس کے ساتھ چل پڑی۔

بندرگاہ کے احاطے سے نکلتے وقت انور علی نے مڑ کر دیکھا تو انسپکٹر برنارڈ مقامی پولیس کے آدمیوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔اس نے جین سے کہا میرا خیال ہے کہ وہ آپ کو پہچان نہیں سکا لیکن اس کے شبہات پوری طرح دور نہیں ہوئے۔"

جین نے کہا۔"مجھے یقین ہے کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا ہوگا۔ بیماری کے باعث میری حالت یہ ہو چکی ہے کہ میں خود آئینے میں اپنی صورت نہیں پہچان سکتی۔ پھر انسپکٹر برنارڈ نے مجھے جن حالات میں دیکھا تھا وہ ایسے نہ تھے کہ اس کے ذہن پر میرا کوئی دیرپا تصور رہ گیا ہو؟"

انور علی نے کہا۔"پھر بھی مجھے اندیشہ ہے کہ انسپکٹر آپ کے متعلق پورا اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ ممکن ہے کہ تھوڑی دیر تک وہ پانڈی چری کی پولیس کے آدمیوں کو میرے کیمپ کی نگرانی کے لیے بھیج دے۔ مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ کل اگر وہ آپ سے ملا تو وہ پوری طرح سے تیار ہو کر آئے گا۔لیگرانڈ کے خط پر اُس نے بلاوجہ قبضہ نہیں کیا۔آپ کیلیے یہی بہتر ہے کہ آپ فوراً پانڈی چری کی حدود سے باہر نکل جائیں۔اگر آپ گھوڑے پر سفر کر سکتی ہیں تو ہمیں ابھی روانہ ہو جانا چاہئے۔"

جین نے کہا۔"میں تیار ہوں لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم تھا کہ میں اس جہاز پر آرہی ہوں؟"

انور علی نے جواب دیا۔"اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ۔لیگرانڈ کو روانہ کرنے کے بعد میں یہاں آنے والا ہر جہاز دیکھا کرتا تھا۔"

جین کچھ دیر خاموشی سے اس کے ساتھ چلتی رہی۔ بالآخر اس نے کہا۔" موسیو مجھے معلوم نہیں کہ آپ کون ہیں لیکن میرے لیے آپ پر اعتماد کرنے کے سوا

کوئی چارہ نہیں۔"

"مجھے آپ اعتماد کے قابل پائیں گی۔" انور علی نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پڑاؤ میں داخل ہوئے۔ سپاہی خیمہ نصب کر رہے تھے۔ انور علی نے انہیں فوراً تین گھوڑے تیار کرنے کا حکم دیا اور دلاور خان سے مخاطب ہو کر کہا۔"دلاور خان تم ہمارے ساتھ جا رہے ہو، میں نے بندرگاہ سے جو بکس بھیجا تھا وہ میرے گھوڑے کی زین کے پیچھے باندھ دو۔ جلدی کرو۔"

پھر وہ اپنے نائب کی طرف متوجہ ہوا۔"سردار خاں! شام تک اس بات کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ کہ میں یہاں سے غیر حاضر ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ انسپکٹر جو اس دن میرے پاس آیا تھا۔ یا پانڈی چری کی پولیس کا کوئی آدمی ہمارے متعلق پوچھنے آئے تم اسے یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرنا کہ میں آرام کر رہا ہوں۔ اگر کوئی مادام لیگرانڈ کے متعلق پوچھے تو بھی تم یہی کہو کہ وہ اپنے خیمے میں سو رہی ہیں۔ بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ آج تمہیں پریشان کرے گا۔ لیکن کل علی الصباح وہ ضرور آئے گا۔ اور تم اسے یہ بتانا کہ مادام فوراً سرنگا پٹم پہنچنے پر بضد تھی اور اب تک وہ کئی میل طے کر چکے ہوں گے۔ آٹھ دس دن تک یہاں میری جگہ دوسرا آدمی پہنچ جائے گا۔ اُسے یہ بتا دینا کہ ایک خاص مجبوری کے باعث میں یہاں ٹھہر کر اس کا انتظار نہیں کر سکا۔"

☆☆

کیمپ سے انور علی اور جین کی روانگی سے کوئی آدھ گھنٹہ بعد برنارڈ انتہائی غم و غصے کی حالت میں پانڈی چری کے گورنر کے سامنے کھڑا یہ کہہ رہا تھا۔"جناب یہ معاملہ بہت سنگین ہے اگر آپ کی پولیس میرے ساتھ تعاون کرتی تو ہم اس لڑکی کو

پانڈی چری سے نکلتے ہی گرفتار کر سکتے تھے۔"

"آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ انور علی اس لڑکی کے ساتھ روانہ ہو چکا ہے؟"

"میں نے بندرگاہ سے واپس آتے وقت دو آدمی اس کے پڑاؤ کی نگرانی کے لیے روانہ کر دیے تھے اور جب انہوں نے یہ اطلاع دی کہ انور علی اُس کا ایک نوکر اور وہ لڑکی کیمپ میں پہنچتے ہی گھوڑوں پر سوار ہو کر کہیں روانہ ہو گئے ہیں تو میں نے فوراً پولیس کو ان کا تعاقب کرنے کے لیے کہا۔ لیکن آپ کے افسروں نے یہ جواب دیا کہ ہم گورنر کے حکم کے بغیر اُن کا پیچھا نہیں کر سکتے۔"

"اگر آپ کو اس لڑکی کی مجرم ہونے کے متعلق اتنا ہی یقین تھا تو آپ نے اُسے جہاز سے اترتے ہی کیوں نہ گرفتار کر لیا؟"

"جناب والا! اس وقت میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اور میں اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اپنے شکوک رفع کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس خط پر قبضہ کر لیا تھا جو اس لڑکی کو انور علی نے بندرگاہ پر دیا تھا اور لیمبرٹ کے ہاتھ کی چند تحریریں جو پیرس کے فوجی اسکول سے میرے قبضے میں آئی تھیں۔ میرے بکس میں تھیں۔ میں ان تحریروں سے اس خط کا موازنہ کرنے کے لیے فوراً اپنی قیام گاہ پر پہنچا۔ اب میں یہ اچھی طرح دیکھ چکا ہوں کہ لیمبرٹ کی تحریریں اس خط سے ملتی ہیں۔ اور لیمبرٹ اور لیگرانڈ ایک ہی آدمی کے دو مختلف نام ہے، ان کا فوراً یہاں سے بھاگ نکلنا بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ لڑکی مجھے دیکھنے کے بعد اپنے آپ کو یہاں محفوظ نہیں سمجھتی تھی۔ اب اگر انہیں گرفتار کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس کی تمام ذمہ داری آپ کی پولیس پر عاید ہو گی۔"

گورنر نے کہا۔" آپ کو معلوم ہے کہ پانڈی چری سے چند میل آگے

انگریزوں کی چوکیاں اور اس کے بعد میسور کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اس لیے ہم زیادہ دوران کا تعاقب نہیں کر سکتے۔''

''جناب مجھے یقین ہے کہ وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ابھی وقت ہے۔''

''میں دو شرائط پر آپ کے ساتھ چند سوار بھیج سکتا ہوں۔پہلی شرط یہ ہے کہ آپ پانڈی چری کی حدود سے آگے ان کا پیچھا نہیں کریں گے۔دوسری شرط یہ ہے کہ اگر آپ کو ناکامی ہوئی تو آپ اپنی غفلت اور کوتاہی کی ذمہ داری میری پولیس پر نہیں ڈالیں گے۔''

''جناب میں نے اگر کوئی کوتاہی کی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ میں آپ کی پولیس کا تعاون حاصل نہ کر سکا۔''

گورنر نے کہا۔''دیکھیے انور علی میسور کی حکومت کا ایک ذمہ دار افسر ہے اور پانڈی چری کے بڑے سے بڑے افسر کو یہ سکھایا گیا ہے کہ وہ میسور کے ہر آدمی کا احترام کرے۔ہم یہاں رہ کر سلطان ٹیپو کی ناراضگی مول نہیں لے سکتے۔اب بھی میں سختی کے ساتھ آپ کو اس بات کی ہدایت کرتا ہوں کہ اگر وہ لڑکی گرفتار ہو جائے تو بھی انور علی کے ساتھ آپ کا برتاؤ انتہائی دوستانہ ہونا چاہیے۔میں اپنا سیکرٹری آپ کے ساتھ بھیج دیتا ہوں اور وہ پولیس کے چند سوار آپ کے ساتھ روانہ کر دے گا۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر انور علی صحیح حالات سے واقف ہونے کے باوجود لڑکی کو پناہ دے چکا ہے تو اب پانڈی چری کی ساری فوج اور پولیس اس کا کھوج لگانے میں کامیاب نہیں ہو گی۔''

''اس صورت میں آپ میسور کی حکومت سے یہ مطالبہ نہیں کر سکیں گے کہ وہ ہمارے مجرم ہمارے حوالے کر دے؟''

"نہیں، میسور میں پناہ لینے کے بعد وہ ہماری دسترس سے باہر ہوں گے۔"

☆☆

دوپہر کے وقت انور علی نے گھنے جنگل میں ایک ٹیلے کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روکا اور مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جین بری طرح نڈھال ہو کر اپنے گھوڑے کی زین پر جھکی ہوئی تھی۔ اور اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

"میں بہت تھک گئی ہوں۔" اس نے سراپا التجا بن کر کہا۔ "اگر یہاں کوئی خطرہ نہ ہو تو تھوڑی دیر ٹھہر جایئے۔"

انور علی نے کہا۔ "ابھی ہم خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلے تاہم آپ کی خاطر ہمیں کچھ دیر رکنا پڑے گا۔ اس ٹیلے کے پار ایک نالہ ہے اور اس کے کنارے آپ تھوڑی دیر آرام کرسکیں گی۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ چکے تھے اور سامنے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا نالہ دکھائی دے رہا تھا۔

انور علی نے کہا۔ "دلاور خاں تم یہیں ٹھہرو، اگر کوئی خطرہ پیش آئے تو ہمیں خبردار کر دینا۔"

جین نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے اب زین پر نہیں بیٹھا جاتا۔ میں پیدل چلوں گی۔"

انور علی نے جلدی سے نیچے اُتر کر دونوں گھوڑوں کی باگیں پکڑ لیں اور جین لڑکھڑاتی ہوئی اس کے ساتھ ٹیلے سے نیچے اترنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پل سے چند قدم دور ایک طرف ہٹ کر نالے کے کنارے رکے۔ جین سرسبز گھاس پر بیٹھ گئی۔ اور انور علی نے گھوڑوں کو پانی پلانے کے بعد ایک

جھاڑی کے ساتھ باندھ دیا پھر اس نے خورجین سے ایک پیالہ نکالا اور نالے سے پانی بھر کر جین کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ پیاس محسوس کر رہی ہیں؟''

اُس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انور علی کے ہاتھ سے پانی کا پیالا پکڑ لیا۔

انور علی نے کہا۔ ''اور آپ کو بھوک بھی ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں ایک مدت کے بعد پہلی بار بھوک محسوس کر رہی ہوں۔''

انور علی نے ایک درخت کے چند پتے توڑے اور نالے کے پانی سے دھونے کے بعد جین کے آگے بچھا دیے۔

جین بد حواس سی ہو کر کہنے بولی۔ ''موسیو! یہ کھانے کی چیز ہے؟''

''نہیں نہیں۔'' انور علی نے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کے کھانے کے برتن ہیں۔'' پھر وہ دوبارہ اپنے گھوڑے کے قریب پہنچا اور خورجین سے ایک روغنی روٹی نکال کر لے آیا اور پتوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیجیے کھانا آ گیا۔''

''آپ نہیں کھائیں گے؟''

''نہیں میں کھا چکا ہوں''

جین نے چند نوالے کھانے کے بعد کہا۔ ''یہ بہت لذیز ہے لیکن کیمپ سے روانہ ہوتے وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کھانا بھی ساتھ لیے جا رہے ہیں۔''

''میں نے جہاز کی اطلاع پاتے ہی اپنے سفر کے لیے چند ضروری انتظامات کر لیے تھے۔''

"آپ کو یہ کیسے معلوم تھا کہ میں اس جہاز پر آ رہی ہوں؟"

"میں ہر نئے جہاز کی آمد پر یہ اُمید لے کر بندرگاہ پر جاتا تھا کہ آپ آ رہی ہیں۔ پہلے تو میں اپنے گھوڑوں پر زینیں بھی ڈلوا رکھتا تھا۔ صرف اس دفعہ تھوڑی سی کوتاہی ہو گئی۔"

جین نے چند اور نوالے کھانے کے بعد کہا۔"موسیو مجھے اس ملک کی رسومات کا کوئی علم نہیں۔ یہ روٹی میری ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ اگر میں ساری نہ کھا سکوں تو آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

انور علی ہنس پڑا۔ وہ دونوں ہنس پڑے۔ پھر جین اچانک سنجیدہ ہو کر بولی۔"
موسیو، میں بہت مدت کے بعد ہنس رہی ہوں۔ یہاں کوئی خطرہ تو نہیں؟"

"یہاں کوئی خطرہ نہیں آپ جی بھر کر ہنس سکتی ہیں۔"

جین نے کہا۔"اگر انسپکٹر برنارڈ کو پتہ چل گیا تو وہ ضرور ہمارا پیچھا کرے گا۔"

"بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن اگر اس نے ہمارا پیچھا کیا تو بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اطمینان سے آرام کریں۔ میرا نوکر ٹیلے پر پہرا دے رہا ہے۔"

جین نے ذرا پیچھے ہٹ کر ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ اس کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں۔ اور چند منٹ کے بعد وہ بچے کی طرح سو رہی تھی۔

انور علی نے نالے کے کنارے بیٹھ کر وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے درخت کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کھولے اور ان کی باگیں پکڑ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ جین کو جگانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ٹیلے کی طرف سے گھوڑے

کی ٹاپ سنائی دی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دلاور خاں بڑی تیزی سے اس کی طرف آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے دلاور خاں؟" انور علی نے بلند آواز میں کہا۔

دلاور خان نے قریب آ کر گھوڑا روکا اور جواب دیا۔ " آٹھ دس سرپٹ سوار اس طرف آ رہے ہیں۔ میں نے انہیں ٹیلے سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر دیکھا ہے۔"

جین نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور پوچھا کیا بات ہے؟"

کچھ نہیں آپ اپنا گھوڑا سنبھال لیں۔" جین نے بھاگ کر اپنے گھوڑے کی باگ پکڑ لیل اور انور علی نے دلاور خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تم پل کے پار جا کر ان کا انتظار کرو اور وہ تمہیں دیکھ لیں تو ایک ہوائی فائر کرنے کے بعد بھاگ نکلو ان مین سے کسی کا گھوڑا تمھارے گھوڑے کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ راستہ انگریزوں کی چوکی کی طرف جاتا ہے۔ اس پل سے دو تین میل آگے تم انہیں چکمہ دے کر دائیں ہاتھ مڑ جانا اور جنگل میں روپوش ہو جاؤ۔ اگر وہ انگریزوں کی چوکی کے قریب پہنچ گئے تو انگریز ان سے نپٹ لیں گے۔ ہم اس نالے کے ساتھ ساتھ جنگل میں سفر کریں گے۔ اور پھر یہاں سے کوئی دو میل دور نالے کے دوسرے کنارے پہنچ کر تمہارا انتظار کریں گے۔"

دلاور خاں کو ہدایت دینے کے بعد انور علی جین کی طرف متوجہ ہوا۔ "چلیے"

جین ان کی زبان سے ناواقفیت کے باوجود یہ اندازہ لگا چکی تھی کہ کوئی خطرہ درپیش ہے۔ اس نے کہا۔" موسیو، مجھے ڈر ہے کہ میں اب گھوڑے پر آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔"

ابھی آپ کو چھوڑے پر سوار ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اطمینان سے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑ کر میرے پیچھے چلتی رہیں۔"

جین اس کے پیچھے چل دی اور وہ جنگل میں روپوش ہو گئے۔ چند قدم دور جا کر وہ رک گئے۔ اور دم بخود ہو کر ٹیلے کی طرف گھوڑوں کی ٹاپ سننے لگے۔ پھر انہیں بندوق کا دھما کا سنائی دیا۔ اور اس کے بعد گھوڑوں کی آہٹ بتدریج کم ہونے لگی۔

انور علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔" اب آپ کا خطرہ گزر چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اندھادھند انگریزوں کی چوکی کے قریب پہنچ جائیں گے۔ اور وہاں سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ واپس آئیں گے۔"

"لیکن آپ کا ساتھی؟"

" اسے کوئی خطرہ نہیں، وہ تھوڑی دیر بعد جنگل میں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ چلیے اب ہمیں کچھ دور اس جنگل میں چلنا پڑے گا۔ آپ کو تکلیف تو ہو گی۔ لیکن ابھی کچھ عرصہ ہمارے لیے کنارے سے دور رہنا ضروری ہے۔ نالہ عبور کرنے کے بعد ہمارا سفر نسبتاً آسان ہو جائے گا اور آپ آزادی سے گھوڑے پر سفر کر سکیں گی۔"

جین نے کہا۔" مجھے سواری کا قطعاً شوق نہیں۔ میں پیدل چلنے میں زیادہ آسانی محسوس کرتی ہوں۔"

جنگل بہت گھنا تھا اور تناور درختوں کے نیچے پھیلی ہوئی جھاڑیوں اور طرح طرح کی بیلوں نے اسے اور بھی دشوار گزار بنا دیا تھا۔ بعض مقامات پر انور علی کو اپنی تلوار سے ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھی ہوئی شاخوں کو کاٹ کر راستہ بنانا پڑتا تھا۔ جین بڑی مشکل سے اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

قریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد اُن کے گھوڑوں نے اچانک کان کھڑے کر لیے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ انور علی نے جلدی سے اپنی تلوار نیام میں ڈالی اور کندھے سے بندوق اُتار کر سامنے جھاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" جین نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"خاموش" انور علی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھے بغیر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

ایک ثانیہ بعد انہیں شیر کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ جین سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ اچانک سامنے جھاڑی میں جنبش پیدا ہوئی اور شیر کے غرانے کی آواز بند ہو گئی۔ انور علی اطمینان کا سانس لیتے ہوئے جین کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ نے شیر دیکھا؟"

لیکن جین کی قوتِ گویائی جواب دے چکی تھی۔ انور علی مسکرایا۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں وہ جا چکا ہے۔"

جین نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ لیکن اُس کی آواز بہت خوفناک تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم پر حملہ نہیں کیا۔"

وہ بھوکا نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان جھاڑیوں کے پیچھے اس کا شکار پڑا ہوا ہے۔"

"آپ نے بندوق نہیں چلائی؟"

"اس کی ضرورت نہ تھی۔"

"آپ نے کبھی شیر مارا ہے؟"

"بہت دفعہ"

"یہ خوفناک جنگل کب ختم ہو گا؟"

"یہ جنگل بہت بڑا ہے لیکن اب تھوڑی دور آگے نالہ عبور کرنے کے بعد آپ کی مشکلات ختم ہو جائیں گی۔"

چند منٹ بعد وہ جنگل سے نکل کر نالے کے کنارے نمودار ہوئے اور انور علی نے کہا۔ "اب آپ گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔ ہمیں یہاں سے نالہ عبور کرنا ہے۔"

"پانی زیادہ گہرا تو نہیں؟"

"نہیں" انور علی نے اپنے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔" آپ اپنا گھوڑا میرے پیچھے رکھیں۔"

جین نے کچھ کہے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی اور وہ کمر برابر پانی میں سے گزر کر نالے کے پار پہنچ گئے۔ اس کے بعد کوئی آدھ میل دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد انور علی اپنا گھوڑا روک کر نیچے اُتر پڑا اور جین کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔" اب ہمیں یہاں اپنے ساتھی کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

جین نے کہا۔" اُسے یہ کیسے معلوم ہو گا کہ ہم یہاں ہیں؟"

"میں نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم دو میل چلنے کے بعد اس کا انتظار کریں گے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ ہم نے ابھی تک صرف دو میل کا فاصلہ طے کیا ہے؟ جین نے حیران ہو کر پوچھا"۔

"ہاں جنگل میں ہماری رفتار بہت سست تھی۔ لیکن دلاور خاں کو اس وقت تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

جین گھوڑے سے اتر کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد انہیں جنگل میں گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ انور علی نے کہا۔ لیجیے وہ آ گیا۔" اور جین اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد دلاور خاں درختوں سے نمودار ہوا اور انور علی نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ تم نے بہت دیر لگائی۔"

"جناب خدا کا شکر ہے کہ آپ مل گئے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میرا رخ کس طرف ہے۔ میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ واپس مڑوں اور دوبارہ پل کے قریب پہنچ کر نالے کے کنارے کنارے اس طرف آؤں۔"

"ہمارا پیچھا کرنے والوں کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

"جناب وہ تو اب واپس پانڈی چری کے قریب پہنچ چکے ہوں گے۔ میں انہیں چکمہ دے کر انگریزوں کی چوکی کے بالکل قریب لے گیا تھا۔ اس کے بعد پگڈنڈی کے قریب جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر اپنی آنکھوں سے ان کی بدحواسی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ بے تحاشا گھوڑے بھگاتے واپس آ رہے تھے اور انگریز سواروں کا ایک دستہ ان کے پیچھے تھا۔ جب وہ گزر گئے تو میں وہاں سے کھسک آیا۔ میں یہ نہیں دیکھ سکا۔ کہ فرانس کی پولیس کا کوئی آدمی زخمی ہوا یا نہیں۔ بہر صورت انگریز ان پر بے تحاشا گولیاں برسا رہے تھے۔"

جین کے استفسار پر انور علی نے فرانسیسی زبان میں اسے اپنے نوکر کی کارگزاری سنا دی اور اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ اس نے کہا۔" موسیو! مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے انسپکٹر برنارڈ کی پسپائی کا تماشا نہ دیکھ سکی۔"

انور علی نے کہا۔ "چلیے اب دیر ہو رہی ہے۔"

وہ گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ اور انور علی نے کہا۔" دلاور خاں ہمیں شام سے پہلے کسی محفوظ جگہ پہنچنا ہے۔ اب تم ہماری رہنمائی کرو۔"

دلاور خاں نے کہا اس جنگل میں تھوڑی دور آگے ایک پگڈنڈی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ کرشنا گری کے راستے سے جا ملتی ہے۔"

"چلو!"

☆☆

غروبِ آفتاب کے وقت چند میل اور طے کرنے کے بعد یہ لوگ ایک پہاڑی کے دامن رُکے اور انور علی نے جین کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔" اب رات ہونے کو ہے اور آگے چند میل تک جنگل زیادہ گھنا ہے اس لئے ہمیں صبح تک یہیں قیام کرنا پڑیگا۔

وہ گھوڑوں سے اتر پڑے جین ایک پتھر پر بیٹھ گیی اور انور علی اور دلاور خان گھوڑوں کو ایک جھاڑی کے ساتھ باندھنے اور ان کی زینں اتارنے میں مصروف ہو گئے پھر انہوں نے پاس شفاف پانی کے ایک چھوٹے سے چشمے سے وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑے ہو گئے جب وہ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو جین پتھر پر بیٹھنے کی بجائے نڈھال سی ہو کر زمین پر لیٹی ہوئی تھی انور علی نے گھوڑوں کی زینوں کے دو نمدے نکال کر اس کے قریب بچھا دیے اور تیسرا نمدہ لپیٹ کر تکیے کی جگہ رکھتے ہوئے کہا آپ شاید زمین پر سونے کی عادی نہ ہوں مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں آپ کے لئے اس سے بہتر بچھونے کا انتظام نہیں کر سکتا۔ آپ کچھ کھا لیں اور اطمینان سے سو جائیں۔

جین نمدے پر بیٹھ گئی اور انور علی نے اپنا رومال اس کے سامنے بچھا دیا اور پھر خود جین سے ایک روغنی روٹی نکال کر رومال پر رکھتے ہوئے کہا یہ وہی کھانا ہے جو آپ نے دوپہر کے وقت کھایا تھا مجھے افسوس ہے کہ ہم راستے میں آپ کے لئے

کوئی شکار بھی تلاش نہیں کر سکے۔

یہ روٹی بہت لذیذ ہے جین نے بے تکلفی سے نوالہ توڑتے ہوئے کہا آپ نہیں کھائیں گے؟ ہم بھی کھالیں کیئے میرے تھیلے میں ابھی کافی روٹیاں پڑی ہیں۔

جین نے چند لقمے کھانے کے بعد باقی روٹی رومال میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی پھر اٹھ کر چشمے سے پانی پیا اور واپس آ کر بیٹھ بیٹھ گئی لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے اچاند اٹھ کر بیٹھتے ہوئے انور علی کی طرف دیکھا اور کہا موسیو میں موت سے نہیں ڈرتے لیکن نیند کی حالت میں موت کا تصور میںے لئے بہت بھیانک ہے آپ کو یقین ہے کہ رات کے وقت یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں میرا مطلب ہے کہ بے خبری کی حالت میں شیر چیتے یا بھڑیے تو ہم پر حملہ نہیں کر دیں گے؟

انور علی نے جواب دیا نہیں آپ اطمینان سے سو جائیں

جین نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا آپ کا ساتھی کہاں گیا ہے۔

وہ آگ جلانے کیلئے خشک لکڑیاں جمع کر رہا ہے ہاں موسیو آگ ضرور جلا دیجئے مجھے اس تاریکی سے بہت خوف آتا ہے

یہ کہہ کر وہ دنیا و مافیا سے بے خبر گہری نیند سو رہی تھی۔ چند گھنٹے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے قریب ہی آگ کا ایک الاؤ دکھائی دیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی انور علی چند قدم دور اپنے ہاتھ میں بندوق تھامے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا آگ کر روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ جین دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہی گزشتہ واقعات اسے ایک خواب معلوم ہوتے تھے یہ نوجوان جو چند گھنٹے قبل اس دے لئے اجنبی تھا اب برسوں کا ساتھی معلوم ہوتا تھا وہ اس کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی۔ کہ تم فرشتے ہو لیکن تشکر اور احسان مندی کے سینکڑوں الفاظ اس کی

زبان تک آ کر رک گئے۔ وہ دبی زبان میں موسیو سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

انور علی نے چونک اُس کی طرف دیکھا اور اُس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ جین نے کہا "موسیو اب کیا وقت ہوگا؟"

انور علی نے جواب دیا۔ "آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہے۔"

"آپ کا ساتھی کہاں ہے؟"

انور علی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، وہ سو رہا ہے۔"

جین نے کہا، "میں بڑی مدت کے بعد اتنی گہری نیند سوئی ہوں مجھے وقت کا احساس تک نہیں رہا۔ اپ شاید بالکل نہیں سوئے۔"

"میں پہرہ دے رہا تھا۔ اب دلاور خاں کی باری ہے؟"

"موسیو مجھے پیاس محسوس ہوتی ہے۔"

"میں ابھی پانی لاتا ہوں۔" انور علی یہ کہہ کر ایک پیالہ اٹھایا اور چشمے سے بھر لایا۔ جین نے پانی پینے کے بعد کہا۔ "یہ جنگل کب ختم ہوں گے؟"

انور علی مسکرایا۔ "آپ جنگل سے بہت ڈرتی ہیں؟"

"نہیں موسیو۔ اب آپ کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مجھے ڈر محسوس نہیں ہوگا۔"

انور علی نے کہا۔ "میرے لیے یہ تکلیف دہ راستہ اختیار کرنا ایک مجبوری تھی۔ ارکاٹ کی حدود میں جگہ جگہ انگریزوں کی چوکیاں ہیں۔ اگر ہم دوسرا راستہ اختیار رکرتے تو ممکن تھا کہ آپ کو کسی چوکی پر روک لیا جاتا اور پھر ان سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ وہ اپ کے متعلق پانڈی چری کی پولیس سے استفسار کرتے اور آپ کو ان کے حوالے کر دیتے لیکن آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ کل دوپہر یا شام تک ہم جنگل

سے نکل کر ایک آباد علاقے میں پہنچ جائیں گے۔ آپ سو جائیں ہمیں علی الصباح یہاں سے کوچ کرنا ہے۔"

انور علی دلاور خاں کی طرف بڑھا اور اسے جگانے کے بعد جین سے چند قدم دور ایک گھوڑے کی زین پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ جین کچھ دیر بیٹھی اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچتی رہی اور رات کی ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے نہایت خوشگوار تھے۔ آسمان صاف تھا اور ستارے معمول سے زیادہ بڑے اور چمکدار معلوم ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر گہری نیند سو رہی تھی۔

☆☆

اگلے دن یہ لوگ چند چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں عبور کرنے کے بعد ایک وادی کے گنجان جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ اچانک انور علی اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کر کے دبے پاؤں ایک طرف بڑھا اور گھنی جھاڑیوں میں روپوش ہو گیا۔ جین بد حواس ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ لیکن دلاور خان کے چہرے پر نہایت درجے کا اطمینان تھا۔ اچانک جنگل میں بندوق کی آواز سنائی دی۔ اور جین چلا چلا کر دلاور خاں سے کچھ پوچھنے لگی۔ دلاور خاں فرانسیسی زبان سے ناواقف تھا۔ اس نے چند بار شکار شکار کہہ کر جین کو تسلی دینے کی کوشش کی اور پھر اشاروں سے سمجھانے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اس نے پہلے اپنی دونوں کہنیاں کانوں کے ساتھ جوڑ کر ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔ پھر گلے میں لٹکی ہوئی بندوق اُتار کر ایک طرف نشانہ باندھا اور بالآخر ایک چھوٹا سا خنجر نکال کر اپنی گردن پر پھیرتے ہوئے کہا۔ شکار شکار، جین کے لیے اُس کی زبان کی طرح اُس کے اشارے بھی ایک معما تھے۔ اور وہ انتہائی اضطراب اور بے بسی کی حالت میں اُس کی

طرف دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک ندی کے کنارے آگ جلا کر ہرن کا گوشت بھون رہے تھے۔ پاس ہی ایک درخت کی شاخوں پر چند بندر کود رہے تھے۔ جین اپنی جگہ سے اٹھی اور درخت کے نیچے جا کر بندروں کی طرف دیکھنے لگی۔ اچانک اسے جنگل کی طرف جھاڑیوں میں کوئی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور ایک ثانیے کے لیے مبہوت سی ہو کر رہ گئی۔ پھر چیخ مار کر وہاں سے بھاگی۔ انور علی اور دلاور خاں بندوقیں اٹھا کر اس کی طرف دوڑے۔ جین نے سراسیمگی کی حالت میں انور علی کا بازو پکڑ لیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ دہشت کے باعث اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ انور علی چند ثانیے جنگل کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر ایک مسکراہٹ کے ساتھ جین کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”ارے یہ تو ہاتھی ہیں آپ اس قدر ڈر گئیں۔“

انور علی کی مسکراہٹ نے جین کا خوف کسی حد تک دور کر دیا اور اس نے کہا۔ آپ ہاتھی کو خطرناک نہیں سمجھتے؟“

”نہیں“

”تو پھر آپ کس چیز کو خوفناک سمجھتے ہیں؟“

انور علی مسکرایا۔ ”میں صرف آپ کا چیخیں مار کر بھاگنا خطرناک سمجھتا تھا۔ ایسی حالت میں جنگل کے جانور عام طور پر بدحواس ہو کر حملہ کر دیتے ہیں۔“

پانچ چھ ہاتھیوں کا ریوڑ چنگھاڑتا اور جھاڑیوں کو روندتا ایک طرف بھاگ رہا تھا۔ جین نے کہا۔ ” مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو بلاوجہ پریشان کیا۔ لیکن جو ہاتھی میں نے دیکھا تھا وہ بہت ہی بڑا تھا۔“

انور علی نے کہا۔ ''جنگل میں ہر ہاتھی پہلی بار بہت بڑا نظر آتا ہے۔ چلیے آپ کا کھانا تیار ہے۔''

☆☆

میسور کی حدود میں داخل ہونے کے بعد جین یہ محسوس کر رہی تھی کہ ماضی کے تاریک سائے اس کا پیچھا چھوڑ چکے ہیں۔ اب اس کے آگے گھنے جنگلوں کے دشوار گزار راستوں کی بجائے کشادہ سڑکیں تھیں۔ میسور کی پہلی چوکی سے انور علی نے اُس کے لیے ایک بیل گاڑی مہیا کر دی تھی اور کرشنا گری سے آگے وہ ایک آرام دہ پالکی میں سفر کر رہی تھی وہ گھبراہٹ اور پریشانی جو اس نے پانڈی چری سے ایک اجنبی کے ساتھ ساتھ روانہ ہوتے وقت محسوس کی تھی۔ اب دور ہو چکی تھی اور وہ ایسا محسوس کرتی تھی کہ انور علی کو وہ مدتوں سے جانتی ہے۔ ابتدائی منازل میں وہ بار بار اُس سے اس قسم کے سوالات کیا کرتی تھی کہ اب سرنگا پٹم کتنی دور ہے۔ ہم کتنے میل آ چکے ہیں۔ اور کتنے میل باقی ہیں۔ ابھی ہمیں کتنی پہاڑیاں، کتنے دریا اور جنگل عبور کرنے ہیں۔ اب راستے میں خطرناک درندوں کے حملے کا خطرہ تو نہیں؟ لیکن اب اس کے لیے صرف یہ جاننا کافی تھا کہ وہ سفر کر رہی ہے اور انور علی اس کا ساتھی ہے۔

پھر ایک دن وہ دوپہر کے وقت ایک بلند چوٹی سے چند قدم دور رکے۔ تھکے ہوئے کہاروں نے انور علی کا اشارہ پا کر جین کی پالکی زمین پر رکھ دی اور پگڈنڈی کے پاس درختوں کے سائے میں بیٹھ گئے۔

انور علی اپنے گھوڑے سے اُترا اور لگام دلاور خاں کے ہاتھ میں دے کر جین کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہمارا سفر ختم ہونے والا ہے آپ اس ٹیلے کی چوٹی سے سرنگا پٹم کی

پہلی جھلک دیکھ سکیں گی۔"

جین پالکی سے اُتری اور کسی توقف کے بغیر تیزی سے ٹیلے کی چوٹی کی طرف بڑھی۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے مڑ کر انور علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ نہیں آئیں گے؟"

"اچھا آتا ہوں" انور علی آگے بڑھا اور جین کے قریب پہنچ کر بولا۔ "سرنگا پٹم دیکھنے کے لیے مجھے اس ٹیلے کی چوٹی پر پہنچنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس شہر کے مناظر ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ٹیلے کی چوٹی پر کھڑے تھے۔ اور جین دم بخود ہو کر سرنگا پٹم کے دلفریب مناظر دیکھ رہی تھی۔ ٹیلے سے نیچے کوئی دو میل دور دریائے کاویری بہہ رہا تھا اور بلند فصیل کے برج شاہی محل کے کنگرے اور مسجد کے گنبد اور مینار دکھائی دے رہے تھے۔

انور علی نے کہا۔" سرنگا پٹم ایک جزیرہ ہے اور دریا کی ایک شاخ اس کی دوسری طرف ہے۔

جین کے ہونٹوں پر ایک دل فریب تبسم تھا اور اس کی آنکھوں میں امید کے چراغ روشن تھے وہ کہہ رہی تھی" یہ میری آخری جائے پناہ ہے۔ یہ مرے سپنوں کی جنت ہے آپ نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔ مجھے اظہارِ تشکر کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ میں ایک بات پر بہت نادم ہوں۔ مجھے اپنا کوئی راز آپ سے نہیں چھپانا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ لیمبرٹ۔ میرا مطلب ہے لیگر انڈ سے میری شادی نہیں ہوئی۔"

انور علی مسکرایا۔ آپ نے میری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ لیگر انڈ

میرا دوست ہے اور وہ مجھے اپنی تمام سرگزشت سنا چکا تھا۔"

جین نے کہا۔ موسیو آپ برا نہ مانیں۔ میں بچپن میں اس ملک کے انسانوں کے متعلق عجیب وغریب باتیں سنا کرتی تھی۔

آپ نے سنا ہوگا کہ ہم وحشی ہیں اور ہم انسانیت کا کوئی احترام نہیں کرتے۔

ہاں اور یہ بھی کہ اس ملک کے لوگوں کی شکلیں بہت خوفناک ہوتی ہیں۔ پانڈی چری کی بندرگاہ پر آپ کو دیکھ کر مجھے اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ آپ اس ملک کے باشندے ہیں تاہم آپ کے ساتھ چلتے وقت مجھے خوف محسوس ہوتا تھا۔ اگر پولیس کا خوف نہ ہوتا تو میں کسی صورت آپ کے ساتھ سفر کرنے پر رضامند نہ ہوتی۔ پانڈی چری سے نکلتے وقت مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ آپ کسی جنگل یا صحرا میں پہنچ کر میرا گلا گھونٹ ڈالیں گے۔

اور اب؟

جین مسکرائی۔ اب تو میں دنیا کے آخری کونے تک آپ کے ساتھ کے۔ لیے تیار ہوں انور علی نے سرنگا پٹم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ میری دنیا کا آخری کونہ ہے اور میں یہ دعا کرتا ہوں کہ وہاں پہنچ کر آپ یہ دیکھیں کہ زندگی کی تمام راحتیں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ میری والدہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی اور میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک آپ کی شادی نہیں ہوتی آپ ہمارے گھر میں رہیں۔ مجھے شاید وہاں پہنچتے ہی کسی محاذ پر بھیج دیا جائے گا اور میرا چھوٹا بھائی بھی شاید زیادہ عرصہ گھر نہ رہ سکے۔ ہماری غیر حاضری کے دوران میں آپ میری والدہ کی جوئی کر سکیں گی مجھے یقین ہے کہ لیگرانڈ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

جین کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اس نے کہا۔ اگر میں آپ کی دعوت

قبول نہ کروں تو یہ شکر گزاری ہوگی۔ اگر آپ دعوت نہ دیتے تو بھی سرنگا پٹم میں میر

ے لیے آپ کا سہارا لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آپ کا گھر کس طرف ہے؟

انور علی نے شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان درختوں کے پیچھے

ہے۔ لیکن آپ یہاں سے نہیں دیکھ سکیں گی۔ اب چلیے انور علی یہ کہ کر پہاڑی

سے نیچے اترنے لگا اور جین اُس کے پیچھے چل پڑی۔ چند منٹ بعد وہ اپنی پالکی پر

سوار ہو رہی تھی۔

☆☆

غروبِ آفتاب سے پہل کچھ دیر پہلے فرحت اور مراد علی مکان کی بالائی منزل

کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ منور خاں ایک صندوقچہ اٹھائے بھاگتا ہوا

کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ بی بی! انور علی صاحب آگئے ہیں۔ دلاور

خاں بھی آگیا ہے۔ وہ ایک میم کو بھی ساتھ لے آئے ہیں۔

مراد علی اپنی کرسی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل کر زینے کی طرف بڑھا۔

نیچے اُتر کر صحن میں داخل ہوتے ہی اُسے انور علی اور جین دکھائی دیے اور وہ بھاگ کر

بے اختیار اپنے بھائی سے لپٹ گیا۔

فرحت برآمدے میں نمودار ہوئی۔ انور علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے

سلام کرنے کے بعد کہا۔ امی جان میرے ساتھ ایک مہمان ہے۔

فرحت نے کہا۔ آؤ بیٹی ہمیں تمہارا انتظار تھا۔

انور علی نے فرانسیسی زبان میں کہا۔ امی جان آپ کا خیر مقدم کرتی ہیں۔

جین مغربی آداب کے مطابق جھک گئی اور فرحت نے شفقت سے دونوں

ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیئے۔

اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ جین کا تعارف کرانے کے بعد انور علی نے پوچھا۔
"لیگرانڈ کہاں ہے؟"

مراد علی نے جواب دیا۔"بھائی جان وہ فوج میں بھرتی ہونے کے چند دن بعد اپنے کیمپ میں چلا گیا تھا۔ وہ ہر روز ان کے متعلق پوچھنے کے لیے آتا ہے۔اور جب سے اُسے یہ معلوم ہوا ہے کہ موسیو لالی کی رجمنٹ سرنگا پٹم سے کوچ کرنے والی ہے وہ بہت زیادہ بے چین رہتا ہے۔میں اسے ابھی اطلاع دیتا ہوں۔"

"ٹھہرو! میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں، مجھے سپہ سالار کی خدمت میں حاضری دینی ہے لیکن نہیں، تم یہیں ٹھہرو۔امی جان کو ان کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے ایک مترجم کی ضرورت پڑے گی۔میں لیگرانڈ کو بھیج دوں گا۔"

ماں نے کہا۔"بیٹا لباس تبدیل نہیں کرو گے؟"

"امی جان میں جو فالتو جوڑے ساتھ لایا تھا وہ اس سے زیادہ میلے ہو چکے ہیں۔راستے میں انہیں دھلوانے کا موقع نہیں ملا۔"

ماں نے کہا۔"تم جو کپڑے یہاں چھوڑ گئے تھے۔وہ سنبھال کر رکھے ہیں۔"

چند منٹ بعد انور علی فوجی مستقر کی طرف روانہ ہو چکا تھا اور فرحت ایک کمرے میں مراد علی کو اپنا ترجمان بنا کر جین کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔قریباً ایک گھنٹہ بعد جین اور لیگرانڈ انور علی کے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے تھے اور جین اسے مریشس سے لے کر سرنگا پٹم تک کے سفر کے واقعات سنا رہی تھی۔

جین کی سرگزشت سننے کے بعد لیگرانڈ نے کہا۔"جین مریشس سے روانہ ہونے کے بعد میری زندگی کا کوئی لمحہ تمہاری یاد سے خالی نہ تھا۔آج محسوس کرتا ہوں کہ یہ میری نئی زندگی کا پہلا دن ہے۔میں میسور کی فوج میں بھرتی ہو چکا ہوں۔اور

چار دن بعد ہمارا دستہ یہاں سے کوچ کر رہا ہے۔ انور علی چاہتا ہے کہ تم ہماری شادی تک اس کی والدہ کے پاس رہو۔ لیکن اگر تمہیں ان کے ہاں رہنا پسند نہ ہو تو یہاں تمہارے لیے کسی علیحدہ مکان کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

جین نے جواب دیا۔ "میں اُن کی دعوت قبول کر چکی ہوں۔ آپ کو میرے متعلق فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔"

"اگر جنگ نہ چھڑ گئی تو میں واپس آ جاؤں گا اور پھر میری پہلی درخواست یہ ہو گی کہ ہمیں کسی تاخیر کے بغیر شادی کر لینی چاہیے۔"

جین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "لیگرانڈ ابھی مجھے اس مسئلہ کے متعلق سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ ہمیں کسی اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ انور علی اور مراد کے ساتھ ایک میز پر کھانا کھا رہے تھے۔ جین کا سفر ان کی گفتگو کا موضوع تھا۔ کھانا کھانے کے بعد جین بظاہر ان باتوں میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہی تھی لیکن تھکاوٹ اور نیند کے باعث اس کا بُرا حال تھا۔

لیگرانڈ نے کہا۔ "تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"میں کچھ تھکاوٹ محسوس کر رہی ہوں۔" اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تو تمہیں آرام کرنا چاہیے۔"

جین اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور انور علی نے کہا۔ "مراد، جاؤ انہیں امی جان کے پاس لے جاؤ۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گئے اور انور علی لیگرانڈ کی طرف متوجہ ہوا۔"

"تم نے اپنی شادی کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟"

ہم نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ہماری بٹالین چار دن بعد یہاں سے کوچ کر رہی ہے۔ ان حالات میں شادی کے متعلق ہم کیا سوچ سکتے ہیں؟"

"میں موسیو لالی سے کہوں گا کہ وہ تمہیں شادی کے لیے بہت جلد چھٹی دیدیں۔ تمہیں ین کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ امی جان تمہاری غیر حاضری میں اس کا خیال رکھیں گی۔ مجھے صرف ایک ہفتہ کے لیے یہاں ٹھہرنے کی چھٹی ملی ہے۔ اس کے بعد مجھے ملیبار یا شمالی سرحد کے کسی قلعے کی حفاظت پر متعین کر دیا جائے گا۔"

لیگرانڈ نے پوچھا۔" آپ نے کہا تھا کہ آپ اپنی جگہ کسی دوسرے افسر کی آمد کا انتظار کیے بغیر پانڈی چری سے آگئے ہیں۔ سپہ سالار اس بات پر خفا تو نہیں ہوئے؟"

وہ بہت خفا ہوئے تھے لیکن میں نے تمہاری اور جین کی سرگزشت سنا کر ان کا غصہ دور کر دیا تھا۔۔ مجھے رخصت کرتے وقت انہوں نے کہا تھا۔" انور علی، میں تم سے بہت خفا ہوں، میں اپنے کسی افسر سے ایسی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر تم اس بے بس لڑکی کی مدد سے کوتاہی کرتے تو میں تم سے بہت زیادہ خفا ہوتا۔ تم نے میسور کے سپاہی کی مدد کی ہے۔ اور میں تمہیں شاباش کا مستحق سمجھتا ہوں۔"

لیگرانڈ نے جواب دیا۔" اب آپ کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔ مجھے اجازت دیجیے۔ میں کل ملوں گا۔"

انور علی نے کہا۔" چلو، میں تم کو دروازے تک چھوڑ آؤں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ڈیوڑھی سے باہر کھڑے تھے لیگرانڈ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔" موسیو، میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔"

انور علی نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے چاند کی روشنی میں اس کی طرف دیکھا۔لیگرانڈ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ بولا'' لیگرانڈ تم میرے دوست ہو۔اور میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا؟''

چوتھا باب

بلقیس اپنی بیٹیوں اور گاؤں کی چند عورتوں کے ساتھ مکان کے ایک کشادہ کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ خادمہ نے چلمن اٹھا کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔" بی بی جی خاں صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔"

بلقیس اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی اور خادمہ نے ڈیوڑھی کے پاس ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" خاں صاحب وہاں ہیں اور ان کے ساتھ ایک مہمان بھی ہے۔"

بلقیس کشادہ صحن عبور کرنے کے بعد کمرے کے دروازے کے قریب رکی اور ایک ثانیہ اندر جھانکنے کے بعد پریشان سی ہو کر ایک طرف ہٹ گئی۔ کمرے سے اکبر خاں کی آواز سنائی دی۔" بلقیس اندر آؤ، یہ مراد علی ہے۔"

بلقیس کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا اور وہ اپنے دل میں خوش گوار دھڑکنیں محسوس کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ مراد علی،" چچی جان، السلام علیکم!" کہہ کر اپنی کرسی سے اُٹھا اور مودب کھڑا ہو گیا۔ کوشش کے باوجود بلقیس اپنے منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ اور اس نے ایک لمحہ توقف کے بعد آگے بڑھ کر اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ مراد علی کے سر پر رکھ دیے۔ اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔" مراد تم اکیلے ہو؟"

" ہاں چچی جان، بھائی جان انور علی گھر سے باہر تھے اور انہیں چھٹی نہیں مل سکی۔"

بلقیس نے کہا۔" میرا خیال تھا کہ تمہاری امی جان ضرور آئیں گی۔"

" چچی جان وہ آنے کے لیے تیار تھیں لیکن ان کی صحت اس قابل نہ تھی کہ وہ

اتنا طویل سفر کر سکتیں، وہ کہتی تھیں کہ جب شہباز کی شادی ہو گی تو میں ضرور آؤں گی۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "بلقیس بیٹھ جاؤ، اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ مراد علی بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک کمسن لڑکی بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی لیکن اچانک مراد علی کو دیکھ کر جھجکتی ہوئی ایک طرف ہٹ گئی اور اکبر خاں کی کرسی کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

اکبر خاں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ثمینہ، یہ تمہارے سرنگا پٹم والے بھیا مراد علی ہیں۔ وہ اتنی دور سے تمہیں دیکھنے آئے ہیں اور تم نے انہیں سلام بھی نہیں کیا؟"

ثمینہ کی آنکھیں مسرت سے چمک اُٹھیں اور وہ بھائی جان اسلام علیکم" کہہ کر پورے انہماک کے ساتھ مراد علی کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر وہ جھجکتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی اور باہر نکل کر پوری رفتار سے بھاگنے لگی۔ آن کی آن میں وہ صحن عبور کرنے کے بعد ایک اور کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کی بڑی بہن تنویر اپنی سہیلیوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ ثمینہ ہانپتی ہوئی آگے بڑھی اور بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس نے اپنا منہ تنویر کے کان سے لگا دیا۔ تنویر نے اُسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ "پگلی میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، انسانوں کی طرح بات کرو۔"

لیکن ثمینہ دوبارہ اس کے ساتھ لپٹ گئی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ آپا جان وہ آگئے ہیں۔"

"کون آگئے ہیں؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

دوسری بولی "ارے ثمینہ یہ کہہ رہی ہے کہ برات والے آگئے ہیں۔"

کمرہ تنویر کی سہیلیوں کے قہقہوں سے گونج اٹھا اور وہ لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

ایک لڑکی نے ثمینہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے۔" اری ثمینہ سچ بتاؤ کون آیا ہے؟"

لیکن ثمینہ نے جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تنویر کی طرف متوجہ ہو کر پوری قوت سے چلائی۔" آپا جان سرنگا پٹم والے بھائی جان مراد علی آ گئے ہیں۔"

تنویر اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی اور اس نے ثمینہ کو بازو سے پکڑ کر قریب بٹھا لیا۔

دوسرے کمرے میں اکبر خاں اور بلقیس کچھ دیر مراد علی سے باتیں کرتے رہے۔ بالآخر اکبر خاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔" میں ذرا باہر مہمانوں کو دیکھوں۔"

بلقیس نے کہا۔" آپ ماموں جان کو دیوان خانے میں بھیج دیں۔ وہ بڑی بے تابی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔"

اکبر خاں نے جواب دیا۔" ماموں جان کے ساتھ آتے ہی ان کی ملاقات ہو گئی تھی۔"

مراد علی نے کہا۔" چچا جان! بھائی شہباز کہاں ہیں؟"

وہ باہر خیمے نصب کروا رہا ہے میں ابھی اُسے بھیجتا ہوں۔"

مراد علی نے اٹھتے ہوئے کہا۔" چچا جان میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

پھر اس نے آگے بڑھ کر دروازے کے پاس پڑی ہوئی ریشمی کپڑے کی ایک گٹھڑی اُٹھائی اور بلقیس کے قریب ایک کرسی پر رکھتے ہوئے کہا۔" چچی جان، امی جان نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔"

اکبر خاں نے کہا۔" دیکھو یہ گٹھڑی تمہیں اسی طرح واپس لے جانی پڑے گی۔ میں نے بار بار ان سے تاکید کی تھی کہ وہ کوئی تکلیف نہ کریں۔"

مراد علی نے کہا۔ ''انہوں نے آپ کے لیے کوئی تکلیف نہیں کی۔ چچا جان وہ یہ کہتی تھیں کہ تنویر اور ثمینہ مجھے اپنے بچوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ خدا نے آپ کو سب کچھ دے رکھا ہے لیکن آپ نے اپنی بچیوں کے لیے ان کے تحائف قبول نہ کیے تو انہیں بہت تکلیف ہوگی۔ آپ ہمیں یہ احساس نہ دلائیں کہ ابا جان کی وفات کے بعد ہم کسی قابل نہیں رہے۔''

مراد علی کے یہ الفاظ ایک نشتر کی طرح اکبر خاں کے دل میں اتر گئے اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بیٹا یہ نہ کہو، تمہاری طرف سے ایک چھیتڑا بھی میرے نزدیک دنیا بھر کے خزانوں سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔''

وہ باہر نکل گئے۔ اور بلقیس نے قدرے تذبذب کے بعد گٹھڑی کھولی۔ گٹھڑی سے ریشم اور زرتار کے چند جوڑوں کے علاوہ صندل کی ایک چھوٹی سی صندوقچی برآمد ہوئی۔ بلقیس نے صندوقچی کا ڈھکنا اٹھایا تو اس کے اندر موتیوں کے ہار، طلائی کنگن اور بالیاں جن میں ہیرے جڑے ہوئے جگمگا رہے تھے۔ صندوقچی میں زیورات کے علاوہ فرحت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک رقعہ بھی تھا۔ جس کا مضمون یہ تھا۔:

''میری پیاری بہن!

مجھے اُمید ہے کہ آپ معمولی تحائف قبول فرمائیں گی۔ زرتار کا جوڑا ننھی ثمینہ کیلیے ہے۔ باقی تمام تنویر کے لیے۔ خدا معلوم میں کب تک زندہ رہوں۔ اس لیے میں نے دونوں بہنوں کے لیے چند زیورات بھیجے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بذاتِ خود اس خوشی میں شریک نہیں ہو سکت۔ لیکن میری دعائیں ہر وقت آپ کے ساتھ ہیں۔''

تمہاری بہن

ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا۔" امی جان وہ کہاں گئے؟"

بلقیس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔" وہ باہر گئے ہیں بیٹی۔"

ثمینہ نے صندوقچی میں ہاتھ ڈال کر موتیوں کا ایک ہار نکالتے ہوئے پوچھا۔"

امی جان یہ آپا کے لیے ہے؟

ہاں بیٹی! یہ تمہارا سرنگا پٹم والا بھائی لایا ہے اور وہ تمہارے لیے بھی بہت سے

زیورات لایا ہے۔ دیکھو۔"

"اور میرے لیے کپڑے بھی لایا ہے۔"

"ہاں"

"ہار بھی؟"

"ہاں! وہ تمہارے لیے کنگن، بالیاں اور انگوٹھی بھی لایا ہے۔"

ثمینہ نے شکایت کے لہجے میں کہا۔" لیکن شہباز بھیا میرے لیے کبھی کوئی

چیز نہیں لاتے۔ الٹا مجھے ڈانٹا کرتے ہیں۔ اب اگر انہوں نے مجھے کچھ کہا تو میں

یہاں نہیں رہوں گی۔"

"تم کہاں جاؤ گی؟" بلقیس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں سرنگا پٹم چلی جاؤں گی" یہ کہتے ہوئے ثمینہ نے موتیوں کا ہار اپنے گلے

میں ڈال لیا۔

بلقیس نے کہا۔" اگر سرنگا پٹم میں کسی نے ڈانٹ دیا تو؟"

"تو پھر میں وہاں بھی نہیں رہوں گی۔ میں ادھونی والی خالہ جان کے پاس چلی

جاؤں گی۔"

بلقیس نے چھیڑتے ہوئے کہا۔" لیکن اگر انہوں نے نہ آنے دیا تو؟"

''واہ جی وہ کیسے نہیں آنے دیں گے۔ میں ان کے برتن توڑ ڈالوں گی۔ میں یہ کہوں گی کہ میں چھت پر چڑھ کر چھلانگ لگا دوں گی اور وہ ہاتھ جوڑ کر مجھے رخصت کریں گے۔

☆☆

اکبر خان کی بستی میں پہنچے کے چند گھنٹے بعد مراد علی کے دل سے اجنبیت کا احساس دور ہو چکا تھا۔ وہاں ایسے لوگ موجود تھے۔ جن کے دل پر اس کے باپ کی یاد نقش تھی یہ لوگ اپنے بچوں کو اپنے ماضی کی جو داستانیں سنایا کرتے تھے۔ ان میں روہیلہ سورماؤں کے ساتھ معظم علی کا ذکر بھی آتا تھا۔ اس کی شکل وصورت اور اس کی جرات ومردانگی ان لوگوں کی کہانیوں اور گیتوں کا مستقل موضوع بن چکی تھی اور جب انھوں نے اکبر خان کی زبانی اس کی شہادت کی خبر سنی تھی تو انھوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ان کا ایک عزیز ترین دوست دُنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔

ان لوگوں کے لیے معظم علی کے بیٹے کی آمد کوئی معمولی بات نہ تھی۔ جوان، بچے اور بوڑھے مراد علی کے راستے میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ وہ گھر سے باہر نکلتا تو عقیدت مندوں کا ایک ہجوم اس کے گرد جمع ہو جاتا۔ جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کے باپ کی دیکھا تھا وہ کہتے تھے اس کی صُورت اس کی چال اس کی گفتگو اپنے باپ جیسی ہے۔

اکبر خاں کا بیٹا شہباز خان اس کے ساتھ پہلی ملاقات میں ہی بے تکلف ہو چکا تھا۔ وہ ایک قوی ہیکل اور خوش وضع نوجوان تھا اور سردار کا بیٹا ہونے کے باعث اسے قبیلے کے لوگوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ آس پاس کی تمام بستیوں میں وہ ایک بہترین سوار اور نشانہ باز مانا جاتا تھا، لیکن اس کی یہ خوبیاں مراد

علی کو متاثر کرنے کے لیے کافی نہ تھیں۔ وہ پہلی ملاقات میں ہی اپنی ذہانت اور تعلیمی قابلیت کا اس پر کوئی اچھا اثر نہ ڈال سکا۔اس نے مراد علی سے متعارف ہوتے ہی پہلے اُسے مکان کے مردانہ حصے میں وہ کمرہ دکھایا جہاں اس نے اپنے شکار کیے ہوئے شیروں اور چیتوں کی کھالیں جمع کررکھیں تھیں۔پھر اچھی نسل کے گھوڑوں کے متعلق بات چل نکلی اور وہ اسے اپنے اصطبل میں لے گیا۔لیکن تھوڑی دیر بعد جب گاؤں کے لوگ مراد علی کی طرف متوجہ ہونے لگےتو شہباز کا احساسِ برتری آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔اگلے دن مراد علی بستی کی ہر محفل کا موضوع بن چکا تھا۔عام حالات میں شہباز خاں کو اپنے ایک مہمان کی آؤ بھگت پر خوش ہونا چاہیے تھا۔لیکن اسے اپنی چھوٹی سی سلطنت میں کسی اور بادشاہ کی مداخلت پسند نہ تھی۔ایک اچھا سوار، ایک بہترین نشانہ باز، ایک نڈر شکاری اور ایک کامیاب زمیندار ہونے کے علاوہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا اطمینان یہ تھا کہ قبیلے میں اپنے باپ کے بعد اُسے انتہائی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہےلیکن اب وہ یہ محسوس کررہا تھا کہ یہ کمسن لڑکا اس بستی میں پاؤں رکھتے ہی ہر محفل کا چراغ بن چکا ہے۔اُسے زیادہ اُلجھن اس وقت ہوئی جب مراد علی شیخ فخر الدین کے ساتھ میسور، دکن، پونا اور کرناٹک کے سیاسی حالات پر بحث کررہا تھا اور اس کا باپ بھی انتہائی انہاک سے اس کی باتیں سُن رہا تھا۔

اس محفل کے برخاست ہونے کے بعد جب اسے تنہائی میں مراد علی سے باتیں کرنے کا موقع ملا تو اس نے کہا۔"مراد تم بہت خوش قسمت ہو کہ اس عمر میں اتنا کچھ سیکھ چکے ہو، مجھے افسوس ہے کہ میری تعلیم بالکل ادھوری رہ گئی۔مجھے صرف گاؤں کے مولوی نے چند کتابیں پڑھائی تھیں۔امی جان مجھے حیدرآباد بھیجنا چاہتی

تھیں۔لیکن میں گھر چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ابا جان بھی اس پر خوش تھے کہ میں حیدر آباد جاؤں۔پھر جب میں بڑا ہوا تو خالو جان نے یہاں آکر کئی بار اصرار کیا کہ میں ادھونی کی فوج میں شامل ہو جاؤں۔وہ یہ کہتے تھے کہ میں بہت جلد ترقی کر جاؤں گا۔لیکن ابا جان ادھونی کی فوج کا نام تک سننا پسند نہیں کرتے۔ وہ الٹا خالو کو سمجھایا کرتے ہیں کہ تم اپنے لڑکے کو سپاہی بنانے کی بجائے کسی اچھے کام پر لگاؤ۔ اب میرے خالو کا لڑکا ہاشم بیگ دوسو سواروں کا سردار بن چکا ہے۔اور میں یہیں ہوں۔خالو جان جب بھی آتے ہیں۔ابا جان سے یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لڑکے پر ظلم کیا ہے۔ اگر یہ فوج میں ہوتا تو ادھونی کے تمام نوجوانوں سے آگے نکل جاتا۔

مراد علی نے کہا۔"آپ کو سپاہی بننے کا شوق ہے؟"

شہباز نے جواب دیا۔"مجھے گھوڑا دوڑانے اور شکار کھیلنے کے سوا کسی چیز کا شوق نہیں،لیکن ادھونی سے جب بھی ہمارا کوئی رشتہ دار آتا ہے تو وہ پہلا سوال یہی پوچھتا ہے کہ تم فوج میں بھرتی کیوں نہیں ہوتے۔اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ مجھے بزدلی کا طعنہ دے رہا ہے۔"

مراد علی مسکرایا۔"ادھونی کی فوج میں بھرتی ہونے سے کوئی آدمی بہادر نہیں بن جاتا۔بہادر صرف وہ ہوتے ہیں جو کسی مقصد کے لیے لڑتے ہیں۔چچا جان برسوں سے ایک سپاہی کا لباس اتار چکے ہیں لیکن ادھونی یا حیدر آباد کی فوج کا کوئی آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ان سے زیادہ بہادر ہے۔"

شہباز خاں نے کہا قدرے مطمئن ہو کر کہا۔" میرا خیال تھا کہ میرے متعلق ہاشم بیگ کی طرح تمہاری رائے بھی شاید یہی ہو کہ میں اپنی کاہلی کی وجہ سے فوج میں

شامل نہیں ہوا۔"

مراد علی نے جواب دیا۔ "نہیں بھائی جان! میں اآپ کے متعلق کبھی بری رائے قائم نہیں کرسکتا اور اگر کبھی ہاشم بیگ نے یہ سوچا کہ اس نے کن مقاصد کے لیے تلوار اٹھائی ہے تو اسے آپ کی بستی کے ایک معمولی کسان کی زندگی بھی قابل رشک نظر آئے گی۔ اگر مجھ سے کوئی یہ کہے کہ تم ادھونی کی فوج کا سپہ سالار بننا چاہتے ہو یا میسور کی بستی میں ایک گمنام کسان کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو میں کسان کی زندگی کو ترجیح دوں گا۔"

شہباز علی کو مراد علی کی یہ بات پسند نہ آئی۔ تاہم وہ اس بات پر ایک طرح کا اطمینان محسوس کر رہا تھا کہ معظم علی کا بیٹا اسے فوج کا کوئی بڑا عہدے دار نہ ہونے کے باوجود قابلِ احترام سمجھتا ہے۔

مراد علی تنویر کی برات کی آمد سے پانچ دن قبل وہاں پہنچا تھا اور یہ پانچ دن اس کے لیے زندگی کا نا قابلِ فراموش حصہ بن چکے تھے۔ گھر میں ننھی ثمینہ سایے کی طرح اس کے ساتھ رہتی تھی۔ تنویر اس سے پردہ کرتی تھی لیکن بلقیس کو جب کبھی تھوڑی بہت فرصت ملتی وہ اسے اپنے پاس بلا لیتی اور گزرے وقتوں کی باتیں شروع کر دیتی۔

ایک صبح تنویر اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ تنویر نے ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ثمینہ یہ کہتی ہیں کہ تمہارے سرنگاپٹم والے بھائی کی ناک چپٹی ہے۔"

"کون کہتی ہے؟" ثمینہ نے غضبناک ہو کر پوچھا۔

"میں کہتی ہوں۔" ثمینہ کی سہیلی نے جواب دیا اور میں یہ بھی کہتی ہوں کہ وہ

گنجا بھی ہے۔"

دوسری سہیلی نے کہا۔"اری میں نے بھی اسے دیکھا ہے اس کا رنگ بالکل سیاہ ہے۔"

"ٹھہرو!" ثمینہ نے منہ بسورتے ہوئے چلمن اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔تنویر نے کہا۔"اب یہ امی جان سے ہماری شکایت کرے گی۔"

چند منٹ بعد تنویر کی ایک سہیلی نے صحن کی طرف دیکھا اور بدحواس ہو کر کہا۔" اری تنویر غضب خدا کا وہ چڑیل اسے اس طرف لا رہی ہے۔"

تنویر نے چلمن کی اوٹ سے صحن کی طرف دیکھا۔ثمینہ مراد علی کا ہاتھ پکڑے دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی اور اُسے کہہ رہی تھی۔" بھائی جان میں نے جھوٹ بولا تھا۔آپ کو امی جان نے نہیں بلایا تھا۔آپ تھوڑی دیر یہاں ٹھہریں میں ابھی آتی ہوں۔"

مراد علی کو تذبذب اور پریشانی کی حالت میں چھوڑ کر وہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی اب اچھی طرح دیکھ لو۔"

تنویر نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھتے ہوئے۔"ثمینہ خدا کے لیے شرم کرو، جاؤ انہیں باہر لے جاؤ ورنہ میں بری طرح پیٹوں گی۔"

ثمینہ تنویر کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہو کر بولی۔" آپ پھر تو نہیں کہیں گی کہ ان کی ناک چپٹی ہے؟"

"خدا کی قسم بالکل نہیں"

ثمینہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی اور مراد علی کا ہاتھ

پکڑتے ہوئے بولی۔ ''آیئے بھائی جان!''

''کیا بات تھی ثمینہ؟'' اس نے صحن سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں بھائی جان، وہ مذاق کر رہی تھیں۔''

''کون مذاق کر رہی تھیں؟''

''آپا کی سہیلیاں''

''کس کے ساتھ''

''میرے ساتھ۔''

''لیکن تم نے مجھے یہ کیوں کہا تھا کہ آپ کو امی جان بلاتی ہیں؟''

''اس لیے کہ وہ آپ کو اچھی طرح دیکھ لیں۔''

''کون''

''وہی جو یہ کہتی تھیں کہ آپ کی ناک چپٹی ہے۔''

''کون کہتی تھیں؟''

''آپا جان کی سہیلیاں''

مراد علی نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ '' اور تمہارا خیال کیا ہے کہ میری ناک چپٹی نہیں؟''

ثمینہ نے رک کر غور سے اس کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے بولی '' بالکل نہیں''۔

☆

اکبر خاں کی تیاریوں سے معلوم ہوتا تھا کہ ادھونی کی برات بڑی دھوم دھام سے آنے والی ہے۔ مکان سے باہر ایک کھلے میدان میں خیمے اور شامیانے نصب

کیے جا رہے تھے۔ اکبر خاں اور شہباز خاں دن بھر شادی کے انتظامات میں مصروف رہتے تھے۔ مراد علی کو بیکار بیٹھنا پسند نہ تھا۔ وہ ان کے کام میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا۔ لیکن بستی کے لوگ فوراً مداخلت کرتے اور کہتے، نہیں جی۔ آپ مہمان ہیں، ان کاموں کے لیے ہم موجود ہیں۔ اکبر خاں کو نمائش کس معنی دے نجتے تھی۔ لیکن ادھونی سے اسے اس قسم کے پیغامات مل چکے تھے کہ برات دھوم دھام سے آئے گی اسوا سے اپنی سادگی اور اسے اپنی سادگی کے باوجود کسی کی زبانی یہ سننا گوارا نہ تھا کہ اس ن اپنی بیٹی کی شادی پر بُخل سے کام لیا ہے۔ چنانچہ مہمانوں کی آؤ بھگت کے لیے وہ اپنے تمام وسائل جمع کرنے میں مصروف تھا۔ پانچویں روز اکبر خاں کے قبیلے کے لوگ گاؤں سے باہر جمع ہو کر حیرت و استعجاب کے عالم میں برات کے شاہانہ ٹھا ٹھ دیکھ رہے تھے تیں ہاتھیوں پر دولھا اور اس کے خاندان کے علاوہ ادھونی کے بڑے بڑے امرا اور سلطنت کے اعلیٰ عہدے دار سوار تھے ہاتھیوں کے پیچھے کوئی پانچ سو آدمی گھوڑں پر سوار تھے اور ان کے پیچھے ساز و سان کی لدی ہوئی گاڑیوں کے ساتھ پیاسہ سپاہیوں نوکروں اور خیمہ برداروں کا ایک ہجوم چلا آ رہا تھا برات کے ساتھ کئی طائفے شہنائیاں بجا رہے تھے اور آتش بازوں کا ایک گروہ گولے اور ہوائیاں چھوڑ رہا تھا،

مہمانوں کی مجموئی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی لیکن اکبر خاں نے قریباً دو ہزار مہمانوں کے قیام و طعام کا بندوبست کر رکھا تھا مراد علی کو یہ معلوم تھا کہ دولھا کا باپ ادھونی کے حکمران خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے لیے برات کی شان و شوکت غیر متوقع نہ تھی تاہم یہ بات اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی کہ مہمانوں کے ساتھ ادھونی کے چند باج گزار مرہٹہ سردار بھی تھے۔ اکبر خاں اس کے قریب

کھڑا شیخ فخر الدین سے انتہائی غصے کی حالت میں کہہ رہا تھا۔ ''شیخ صاحب یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ میری لڑکی کی برات پر میری قوم کے بدترین دشمنوں کو لے کر آئیں گے۔ مرزا طاہر بیگ کو مرہٹوں کے متعلق میرے جذبات کا علم تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے یہ حماقت کی ہے۔'' اور شیخ فخر الدین اسے سمجھا رہا تھا۔ ''بیٹا! تم نے ادھونی کے شاہی خاندان سے رشتہ جوڑا ہے۔ اور یہ لوگ ادھونی کے باج گزار ہیں۔ اگر تم طاہر بیگ کو پیغام بھیج دیتے تو وہ یقیناً تمہارے جذبات کا احترام کرتا۔ لیکن اب تمہیں حوصلے سے کام لینا چاہیے۔''

براتی اپنے گھوڑوں اور ہاتھیوں سے اُتر کر وسیع شامیانے کے نیچے جمع ہو رہے تھے اور گاؤں کے لوگ ان کے گھوڑے اور ہاتھی سنبھالنے میں مصروف تھے۔

رات کے وقت کھانا کھلانے کے بعد مہمانوں کو ان کی حیثیت کے مطابق مختلف خیموں میں جگہ دی گئی۔ دولھا اور اس کے خاندان کے بعض افراد اور ادھونی کے چند معززین کو مکان کے مردانہ حصے میں ٹھہرایا گیا۔ مراد علی دیر تک مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف رہا۔ اور بالآخر شامیانے کے نیچے پڑی ہوئی ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ اچانک اسے شہباز خاں کی آواز سنائی دی۔ ''مراد علی! مراد علی!'' اور اس نے جلدی سے اٹھ کر کہا۔ ''بھائی جان میں یہاں ہوں۔ کیا بات ہے؟''

شہباز نے اس کے قریب آ کر کہا۔ ''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ چلیے آپ کو ابا جان بلا رہے ہیں۔''

مراد علی اس کے ساتھ چل دیا اور تھوڑی دیر بعد مکان کے مردانہ حصے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے اندر شیخ فخر الدین بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اکبر خاں اس کے قریب دوسری چارپائی پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس نے مراد علی کو

دیکھتے ہی کہا۔ ''بیٹا تم کہاں چلے گئے تھے؟''

''چچا جان میں باہر شامیانے کے نیچے لیٹ گیا تھا۔''

اکبر خاں نے کہا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ آج میرے گھر کے اندر تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں؟''

''نہیں چچا جان، میرا خیال تھا کہ یہاں صرف مہمانوں کو ٹھہرنا چاہیے۔''

''میرے نزدیک کوئی مہمان تم سے بہتر نہیں، تم یہاں آرام کرو۔''

مراد علی کچھ کہے بغیر ایک بستر پر لیٹ گیا۔

☆

اگلے روز اکبر خاں کے گاؤں میں ایک میلے کا سا سماں تھا۔ مہمانوں کا ایک گروہ شامیانے کے نیچے جمع ہو کر قوالی سن رہا تھا۔ بعض مہمان اپنے خیموں کے اندر بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ اور بعض کھلے میدان میں جمع ہو کر نیزہ بازی اور نشانہ بازی کے مقابلوں میں حصہ لے رہے تھے۔ دولھا اور اس کا باپ چند معززین کے ساتھ حویلی کی چار دیواری کے اندر ایک شامیانے کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔

ہاشم بیگ ایک خوش وضع نوجوان تھا اور دولھا کے لباس میں ایک شہزادہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دائیں طرف شیخ فخر الدین اور اکبر خاں اور بائیں طرف طاہر بیگ اور اس کے خاندان کے چند عمر رسیدہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مراد علی ہاشم بیگ کے پیچھے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ملک کے ماضی اور حال کے واقعات پر گفتگو ہو رہی تھی اور ادھونی کے سیاست دان اور فوجی افسر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ کسی نے سلطان ٹیپو کا ذکر چھیڑ دیا اور مراد علی اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں سلطان ٹیپو کی ذات کئی زبانوں کے زہر آلودہ تیروں کا

ہدف بن چکی تھی۔

ادھونی کے ایک سردار نے کہا۔ ”ٹیپو اس ملک کا مغرور ترین آدمی ہے۔ وہ کسی کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتا۔ وہ اپنے آپ کو حضور نظام الملک سے بھی بڑا سمجھتا ہے۔“

دوسرا بولا۔ ”ٹیپو اس ملک کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے وہ ہماری تہذیب اور روایات کا بدترین دشمن ہے۔ وہ اونچ اور نیچ کی تمیز مٹانا چاہتا ہے۔ اس کے دربار میں کورنش بجالانے یا جھک کر سلام کرنے کی ممانعت ہے وہ اپنے سامنے کسی رذیل ترین آدمی کا بھی سر جھکا کر کھڑا ہونا پسند نہیں کرتا وہ اسلام کی آڑ لے کر اس ملک کے شرفاء کو رذیلوں اور بھکاریوں کے ہاتھوں ذلیل کروانا چاہتا ہے۔ میسور میں ادنیٰ اور اعلیٰ کو ایک سطح پر لانے کا جو تجربہ اس نے شروع کیا ہے۔ اس کے نتائج اس ملک کے تمام حکمرانوں کے لیے بے حد خطرناک ہوں گے۔ اس نے اپنی رعایا کے ادنیٰ لوگوں میں ایک نیا احساس پیدا کر دیا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے عوام کسی نہ کسی دن میسور کے حالات سے ضرور متاثر ہوں گے۔ ہم یا تو انھیں اپنے مساوی درجہ دینے پر مجبور ہو جائیں گے یا ہمیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ان کے ساتھ ایک تباہ کن جنگ لڑنی پڑے گے۔“

ادھونی کے ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”ٹیپو جیسا بے تدبیر انسان ہمارے لیے کس خطرے کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اس نے ساری دُنیا کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا ہے اور وہ جس طوفان کو مدت سے دعوت دے رہا ہے وہ بہت جلد میسور کی سرحدوں پر نمودار ہونے والا ہے۔ اس دفعہ ہم اور ہمارے انگریز اور مرہٹہ اتحادی پرانی غلطیوں کا اعادہ نہیں کریں گے۔ اب ہماری پہلی منزل سرنگا پٹم ہو گی۔“

ایک مرہٹہ سردار بولا۔ ”صاحبان ہمیں اس کی فوجی قوت سے کوئی خطرہ نہیں

لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ اگر ہم نے متحد ہو کر اس کے خلاف فوراً کارروائی نہ کی تو چند سال بعد ہمیں پچھتانا پڑے گا۔ میسور کے وہ شرفا جو اپنی خاندانی عزت اور وقار بچانے کیلیے آج ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں۔ ایک ایک کر کے مغلوب ہوتے جائیں گے۔ ٹیپو جسے بعض لوگ ایک بے تدبیر انسان سمجھتے ہیں۔ اپنی رعایا کی محبت خریدنا جانتا ہے۔ اس نے عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہزاروں گھرانے سرکاری زمینوں پر آباد کر دیے ہیں۔ وہ بنجر علاقے جہاں اناج کا ایک دانہ پیدا نہیں ہوتا تھا اب لہلہاتے کھیتوں اور باغوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس نے لاکھوں انسانوں کو کنوئیں اور نہریں کھودنے اور سڑکیں بنانے کے کام پر لگا دیا ہے۔ اس لیے یہ لوگ اسے اپنا دیوتا سمجھتے ہیں۔ اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہمیں میسور کی فوج اور میسور کے عوام کی متحدہ قوت کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

مرزا طاہر بیگ نے اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "جی، آپ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔ آپ ہماری تیاریوں سے بے خبر نہیں ہو سکتے۔ ہم لوگ صرف حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اکبر خاں بے چینی کی حالت میں کرسی پر بیٹھا بار بار پہلو بدل رہا تھا اور شیخ فخر الدین بار بار اُس کے کان میں کہہ رہا تھا۔ "نہیں بیٹا، حوصلے سے کام لو۔ تمہیں اس معاملے میں زبان نہیں کھولنی چاہیے۔"

مراد علی کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور وہ اچانک اُٹھ کر چلایا، "مرزا صاحب اگر حکم سے آپ کا مطلب انگریزوں کا حکم ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس محفل میں زبان کھول

رہا ہوں۔ آپ اس شخص کے مہمان ہیں جسے میں اپنا باپ سمجھتا ہوں۔ لیکن آپ نے اس شخص کو موضوع بحث بنایا ہے جسے میں صرف میسور ہی نہیں بلکہ پورے ملک کی عزت اور آزادی کا آخری محافظ سمجھتا ہوں۔"

محفل پر ایک سناٹا چھا گیا۔ ادھونی کے مغرور اُمراء حیرت، پریشانی اور اضطراب کی حالت میں اس نوجوان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جس کی موچھوں کے بال ابھی تک سیاہ نہیں ہوئے تھے۔ مراد علی کی نگاہیں ساری محفل کو دعوتِ مبازرت دے رہی تھیں۔ اس نے کہا۔" آپ کو اس بات پر اعتراض ہے کہ سلطان ٹیپو نے اپنے دربار میں کورنش بجا لانے کی رسم بند کر دی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے سلطان کو صرف ان چند لوگوں کی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جنھوں نے حکومت کی کرسیوں پر بیٹھ کر صرف اپنے ہم جنسوں کو ذلیل کرنا سیکھا ہے۔ سلطان ٹیپو ایک حکمران ہے لیکن حکمران سے کہیں زیادہ وہ اپنے آپ کو ایک انسان سمجھتا ہے۔ اور اسے انسانیت کی تذلیل گوارا نہیں۔ اس نے زندگی کے آداب انسانیت کے اس عظیم ترین محسن سے سیکھے ہیں۔ جس نے کالے اور گورے، ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق مٹایا تھا۔ جس نے ایک حبشی غلام کو خاندانِ قریش کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا۔

آپ کو یہ اعتراض ہے کہ سلطان ٹیپو ساری دنیا کے ساتھ قوت آزمائی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ اس وقت بھی ان کے ایلچی پونا اور حیدر آباد کے حکمرانوں کو امن اور صلح کا پیغام دے رہے ہیں۔

آپ کو یہ شکوہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کے بھوکے اور ننگے انسانوں کو خوش حالی اور آسودگی کا راستہ دکھا کر ایسے معاشرے کی طرح ڈال رہا ہیں جو اس ملک سے اونچ

اونچ نیچ کا امتیاز مٹا دے گا۔ اور یہ آپ کے خلاف ایک سازش ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہ انسانیت کے ان دشمنوں کی سازش کا جواب ہے جنہوں نے اس ملک کے کروڑوں انسانوں کو صدیوں تک ان کے پیدائشی حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔

آپ کو اپنی اور اپنے انگریز اور مرہٹہ ساتھیوں کی فوجی قوت پر ناز ہے لیکن میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ اب میسور ان لوگوں کی شکار گاہ نہیں رہا۔ جنہوں نے بھوکے، نادار اور بے بس انسانوں کو پاؤں تلے روندنا سیکھا ہے۔ بلکہ ان لوگوں کا دفاعی حصار ہے۔ جو عزت اور آزادی کی فضا میں سانس لینا سیکھ چکے ہیں۔ وہاں آپ کا مقابلہ کسی ایسے حکمران سے نہیں ہوگا۔ جس نے اپنی رعایا کی ہڈیوں پر عشرت کدے تعمیر کیے ہوں۔ بلکہ ایک ایسے حکمران سے ہوگا جو اپنے خون اور پسینے سے اپنی رعایا کی پرورش کر رہا ہے۔

میں اس ملک کے مستقبل کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ سلطان ٹیپو کی فتح انسانیت کی فتح ہوگی۔ اور ان کی شکست حیدر آباد یا پونا کی افواج کی بجائے ان لٹیروں اور رہزنوں کی فتح ہوگی جو سات سمندر عبور کرنے کے بعد اس ملک کی عزت اور آزادی کے خلاف اعلان جنگ کر چکے ہیں۔ آج آپ لوگ سلطان ٹیپو کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ لیکن خدانخواستہ اگر میسور میں ان کا پرچم سرنگوں ہوا تو وہ دن دور نہیں جب اس ملک کے تمام حکمران یہ کہیں گے کہ وہ مجاہد جس کا تاج اُتار کر ہم نے انگریزوں کے قدموں میں ڈالا تھا۔ اس ملک کی آزادی کا آخری محافظ تھا۔"

مراد علی نے اپنی تقریر ختم کی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا شامیانے سے باہر نکل آیا۔ محفل کا سکوت ٹوٹ چکا تھا۔ اور حاضرین ایک دوسرے سے کانا پھوسی

کرنے کے بعد آہستہ آہستہ بلند آواز میں احتجاج کر رہے تھے۔ "یہ کون تھا؟ ٹیپو کا جاسوس یہاں کیسے آ گیا؟ اس کی زبان نوچ ڈالنی چاہیے۔"

اکبر خاں نے اپنی کرسی سے اٹھ کر کہا۔ "آپ لوگ اس محفل میں اگر ٹیپو کو موضوع بحث نہ بناتے تو یہ ناخوشگوار سورت پیدا نہ ہوتی۔ مراد علی ٹیپو کا سپاہی ہے۔ اس کے والد اور اس کے دو بھائی ٹیپو کے جنڈے تلے انگریزوں کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہو چکے ہیں۔ اس کے چچا اور اس کے دادا' اس کے ماموں اور اس کے نانا پلاسی کے معدان میں شہید ہوئے تھے۔ مجھے اس سے یہ توقع نہ تھی کہ کسی محفل کا خوف یا احترام سے کوئی غلط بات سُننے پر مجبور کر دے گا۔ مجھے سرنگا پٹم' پونا یا حیدر آباد کی سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں اور آپ حضرات سے میں یہ عرض کرو گا کہ آپ لوگ یہ اپنی جنگی قابلیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک شادی کی تقریب پر جمع ہوئے ہیں۔"

ادھونی کے ایک سردار نے کہا۔ "لیکن اس نے ہماری توہین کی ہے ہم کل کے بچے کی یہ زبان درازی برداشت نہیں کر سکتے۔"

ایک خوش پوش اور بارُعب آدمی جو طاہر بیگ کے قریب بیٹھا ہوا تھا' اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس نے کہا۔ "بھئی اس نے ہماری توہین نہیں کی۔ اس نے تمھیں یہ سمجھایا ہے کہ ہر محفل ہر بات کے لیے موزوں نہیں ہوتی۔ اگر وہ نوجوان ٹیپو کا سپاہی ہے تو ہمیں اس کی جرات اور ہمت کی داد دینی چاہیے۔ اس نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور ادھونی کی فوج کے افسروں کے سامنے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ اب ہمیں کسی اور موضوع پر گفتگو کرنی چاہیے۔"

یہ میر نظام خاں کا بھتیجا امتیاز الدولہ تھا اور اس کے الفاظ حاضرین کے لیے

ایک حکم کا درجہ رکھتے تھے۔

مراد علی انتہائی اضطراب اور پریشانی کی حالت میں ڈیوڑھی سے باہر کھڑا تھا۔ شہباز خاں باہر نکلا اور یہ کہہ کر اس کے قریب سے گزر گیا۔ ''مراد تم نے اچھا نہیں کیا۔''

مراد علی نے اپنے دل پر ایک جھٹکا محسوس کیا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ '' آپ نے آپا جان کی شادی کے خرمے نہیں کھائے؟''

مراد علی نے مڑ کر دیکھا اور ثمینہ نے اپنی جھولی کھول کر اس کے آگے کر دی۔ ''لیجیے!'' اس نے کہا۔

مراد علی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک خرمہ اٹھا لیا۔

ثمینہ نے کہا۔ ''نہیں اور لیجیے۔ یہ سب آپ کے لیے ہیں۔ کچھ کھا لیجیے اور باقی سرنگاپٹم لے جائیے۔''

مراد علی نے کہا۔ ''ثمینہ تم انہیں اپنے پاس رکھو۔ جب میں یہاں سے جاؤنگا تو لے لوں گا۔''

اکبر خاں ڈیوڑھی سے نمودار ہوا اور مراد علی نے محسوس کیا کہ اب اسے شاید کسی انتہائی ناخوشگوار صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے۔ لیکن اکبر خاں اس کی توقع کے خلاف مسکرا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مراد مجھے ڈر تھا کہ تم روٹھ گئے ہو گے۔ میں نے شہباز کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔ اس نے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کی۔''

مراد علی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو اُمڈ آئے اور اس نے کہا۔ ''چچا جان میں بہت شرمسار ہوں۔ مجھے اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔''

اکبر خاں نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا تم نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور مجھے تم پر فخر ہے۔''

''لیکن چچا جان وہ آپ کے مہمان تھے۔''

''تم نے ان کے دماغ درست کر دیئے ہیں۔ امتیاز الدولہ تمہاری باتوں سے بہت متاثر ہوا ہے وہ نظام کا بھتیجا ہے اور اس نے تمہارے ساتھ علیحدگی میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ چلو تم اپنے کمرے میں بیٹھو۔ میں اسے وہاں لے آتا ہوں۔''

مراد علی اور اکبر خاں دوبارہ حویلی میں داخل ہوئے اور ثمینہ وہاں سے کھسک گئی۔ اکبر خاں شامیانے کی طرف چلا گیا اور مراد علی دیوان خانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ ادھونی کے اُمراء کے سامنے اپنی تقریر کے بعد اسے نظام کے بھتیجے کے ساتھ ملاقات کے تصور سے ایک الجھن سی محسوس ہوتی تھی۔

چند منٹ بعد اکبر خاں اور امتیاز الدولہ کمرے میں داخل ہوئے اور وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

امتیاز الدولہ مصافحہ کرنے کے بعد اس کے قریب بیٹھ گیا اور اکبر خاں نے کہا۔

''اب آپ اطمینان سے باتیں کیجیے۔

اکبر خاں باہر نکل گیا اور امتیاز الدولہ نے مراد علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔'' تمہارا نام مراد علی ہے؟''

''جی ہاں''

''سلطان کی فوج میں تمہارا عہدہ کیا ہے؟''

مراد علی نے جواب دیا۔'' جناب، فوجی مکتب سے فارغ التحصیل ہونے کے

بعد میں ان دنوں رخصت پر ہوں۔ اس کے بعد مجھے چند مہینے کسی رسالے میں ایک ادنیٰ افسر کی حیثیت سے کام کرنا پڑے گا۔ پھر اگر مجھے کسی ذمہ داری کا اہل سمجھا گیا تو کسی دستے کی کمان دی جائے گی۔"

امتیاز الدولہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میں تمہاری باتوں سے بہت متاثر ہوا ہوں اور میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سلطان ٹیپو کے متعلق دکن کے ہر آدمی کے وہ خیالات نہیں جو تم اس محفل میں سن چکے ہو۔ وہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو انہیں اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ اور جو دکن اور میسور کے موجودہ اختلافات کو اپنے مستقبل کے لیے اچھا شگون خیال نہیں کرتے۔ اور میں ان میں سے ایک ہوں۔ مجھے نظام الملک اور سلطان ٹیپو کے درمیان کوئی ایسی خلیج نظر نہیں آتی جسے پاٹا نہ جا سکتا ہو۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ میسور اور دکن کے حقیقت پسند اور صحیح الخیال لوگ جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں کی اجتماعی بقا کے لیے دونوں حکومتوں کے اختلافات دور کرنے کی مخلصانہ کوشش جاری رکھیں۔"

مراد علی نے جواب دیا۔ "اگر آپ کے خیالات یہ ہیں تو میں آپ سے ملنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میسور کا ہر باشعور آدمی پانچوں وقت نماز کے بعد میسور اور دکن کے اتحاد کے لیے دعا کرتا ہے۔ اور وہاں ایک شخص ایسا بھی ہے جس کے ہر سانس کے ساتھ صرف دکن اور میسور ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر مسلمان کے لیے دعائیں نکلتی ہیں اور وہ سلطان ٹیپو ہیں۔"

امتیاز الدولہ نے کہا۔ "کاش میں بھی تمہاری طرح پوری خوداعتادی کے ساتھ نظام الملک کے متعلق کچھ کہہ سکتا، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ حضور نظام الملک،

سلطان ٹیپو کو اپنا حریف سمجھتے ہیں۔ تاہم میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کسی دن سلطان ٹیپو میرے جیسے بے بس انسانوں کی طرح حضور نظام کو بھی صحیح راستہ دکھا سکیں گے۔ قدرت نے انہیں جس مقصد کے لیے منتخب کیا ہے وہ ضرور پورا ہو گا۔ جو رہنما تمہاری عمر کے نوجوانوں میں یہ جذبہ پیدا کر سکتا ہے اسے نظام الملک کو متاثر کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ میں صدقِ دل سے یہ دعا کرتا ہوں کہ سلطان کے ایلچی نظام الملک کو انگریزوں اور مرہٹوں سے علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں۔

جب تم اس محفل میں تقریر کر رہے تھے تو میں محسوس کر رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ دکن اور میسور کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو دکن کے لوگ مجھے نظام کے سپاہیوں کی اگلی صف میں دیکھیں گے۔ میں اس کے لیے لڑوں گا میں اپنے سینے پر گولی کھاؤں گا۔ لیکن مرتے دم بھی سلطان ٹیپو کی شکست کے لیے دعا نہیں کر سکوں گا۔ میری آخری خواہش یہی ہو گی کہ دکن اور میسور کے درمیان ایک دائمی اتحاد کا معاہدہ میرے خون کی روشنائی سے لکھا جائے میں بار بار یہ سوچتا ہوں کہ آج تک جنوبی ہندوستان کی سرزمین پر اس ملک کے باشندوں کا جو خون گرا ہے وہ صرف فرنگی استبداد کی آبیاری کے کام آیا ہے۔"

مراد علی خاموشی سے امتیاز الدولہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی گفتگو سے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی اور کی بجائے اپنے آپ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

شیخ فخر الدین کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ آپ باہر قوالی سن رہے ہیں۔"

امتیاز الدولہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ "شیخ صاحب،

یہ ایام قوالی سننے کے لیے موزوں نہیں۔ میں اس نوجوان سے اپنی قوم کے حال اور مستقبل کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔"

شیخ فخر الدین نے واپس دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔"تو مجھے اس محفل میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اپنے مستقبل کی منزل بہت قریب نظر آتی ہے۔اور میں ان دنوں صرف اپنے ماضی کے متعلق سوچا کرتا ہوں۔"

امتیاز الدولہ نے کہا۔"نہیں شیخ صاحب تشریف رکھیے، شاید ماضی کے متعلق آپ کی باتیں سن کر ہم اپنے حال اور مستقبل کی تلخیوں کو تھوڑی دیر کے لیے بھول جائیں۔"

شیخ فخر الدین ہنستا ہوا امتیاز الدولہ کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔"لیکن اگر میرے ماضی کی تلخیاں آپ کے حال اور مستقبل سے زیادہ ہوئیں تو؟"

امتیاز الدولہ مسکرایا۔"تو ہم آپ کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

شیخ فخر الدین نے کہا۔"جناب میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میرے پہلو میں دل ہی نہیں ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ معظم علی جیسے لوگ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں اور میں یہاں بھٹکتا پھروں۔"

"معظم علی کون تھا"

"معظم علی مراد کے والد تھے۔"

"آپ انہیں جانتے تھے؟"

"جی ہاں! اور میرے لیے اپنے مستقبل کے متعلق چند حسین امیدوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر خدا نے مجھے جنت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی اجازت دی تو

میں کسی دن اس نوجوان کو دیکھوں گا جسے جاننا میری زندگی کی سب سے بڑی سعادت تھی۔"

"آپ انہیں کب ملے تھے؟"

"ہماری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب میں اپنی بہن اور بھانجیوں کے ساتھ دلی سے حیدرآباد آرہا تھا۔ اور راستے میں ڈاکوؤں نے ہمارے قافلے پر حملہ کر دیا تھا اُس وقت ہمیں چاروں طرف موت دکھائی دیتی تھی۔ پھر چند آدمی اچانک ہماری مدد کو پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک معظم علی اور دوسرا اکبر خاں تھا۔ ڈاکو کئی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے اور میں معظم علی اور اکبر خاں کو دیکھ کر یہ محسوس کر رہا تھا کہ خدا نے ہماری اعانت کے لیے دو فرشتے بھیج دیے ہیں۔"

اب معظم علی اور اکبر خاں کی شخصیتیں شیخ فخر الدین کی گفتگو کا موضوع بن چکی تھیں اور مراد اور امتیاز الدولہ اس کی باتوں میں ایک رنگین کہانی کی دلکشی محسوس کر رہے تھے۔

شہباز خاں کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے کہا۔ "جناب مہمان دستر خوان پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں چلیے۔"

وہ اُٹھ کر باہر نکل آئے۔ مراد علی تذبذب کی حالت میں امتیاز الدولہ اور فخر الدین کے پیچھے آرہا تھا۔ شہباز خاں نے مراد علی کا بازو پکڑتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "مراد میں اپنے طرزِ عمل پر بہت نادم ہوں۔ ابا جان مجھ پر بہت خفا ہوئے تھے۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

مراد علی کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا اور اس نے جواب دیا۔ "آپ کو معذرت کی ضرورت نہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ اس محفل میں آپ کی خاطر مجھے

اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔ امتیاز الدولہ سے ملاقات کے بعد مراد علی کی ذہنی الجھن بہت حد تک دور ہو چکی تھی۔ تاہم ادھونی کے باقی مہمانوں کے طرزِ عمل سے وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ ان کے دلوں پر ابھی تک اس کی تقریر کی تلخی باقی ہے۔ فوج کے عہدہ دار خاص طور پر اس کے ساتھ باتیں کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔ اسے عام مہمانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن طاہر بیگ اور ہاشم بیگ کی بے اعتنائی اس کے لیے بے حد تکلیف دہ تھی۔ اس نے چند بار ان سے ہم کلام ہونے کی کوشش کی۔ لیکن اُن کی نگاہیں بہت حوصلہ شکن ثابت ہوئیں۔

طاہر بیگ کے متعلق وہ یہ سوچ سکتا تھا کہ وہ ایک بڑی عمر کا آدمی ہے اس کے علاوہ ادھونی کا ایک بہت بڑا جاگیردار اور فوج کا ایک اعلیٰ افسر ہونے کی وجہ سے بھی سے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ہاشم کو وہ شہباز خاں کی طرح اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ اور اسے اس بات کا رنج تھا کہ اسے اکبر خاں کی بیٹی کے شوہر کے سامنے اپنی محبت اور خلوص کے اظہار کا موقع نہیں ملا۔ وہ بار بار ہاشم بیگ کی طرف دیکھتا۔ اور اپنے دل میں کہتا۔ ''میرے بھائی تم اکبر خاں کے داماد ہو یہ درست ہے کہ تم ادھونی میں پیدا ہوئے ہو اور میں نے سرنگا پٹم میں آنکھ کھولی ہے لیکن ہم ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہو سکتے۔''

اگلے دن برات رخصت ہو چکی تھی۔ شیخ فخر الدین براتیوں کے ساتھ ادھونی جا چکے تھے۔ مراد علی بھی واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن اکبر خاں نے اصرار کر کے دو دن اور اسے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ تیسرے دن وہ رخصت ہوتے وقت یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ مدتوں اکبر خاں کے گھر میں رہ چکا ہے۔ اور وہ بلقیس کی دعائیں لینے کے بعد گھر سے نکلا۔ اکبر خاں، شہباز خاں اور ثمینہ دروازے تک اس کے